مزامیر

یعنی

اِنتخابِ کلامِ میرؔ

(جلد دوم)

مُرتبہ

نواب جعفر علی خاں صاحب اثرؔ لکھنوی

کتابی دُنیا لمیٹڈ۔ دھلی

بار اوّل ۱۰۰۰ — جولائی ۱۹۴۷ء

قیمت عہ

مطبوعہ جمال پرنٹنگ پریس دہلی

فہرست

جلد اوّل

جلد دوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیوانِ دوم

ہر ذی حیات کا ہے سبب جو حیات کا
نکلے ہے جی ہی اُس کے لیے کائنات کا

بکھری ہے زُلف اُس رُخِ عالم فروز پر
ورنہ بناؤ ہووے نہ دن اور رات کا

اشجار خامہ ہوویں، جو آبِ سیہ بحار
لکھنا نہ تو بھی ہو سکے اُس کے صفات کا

اُس کے فروغِ حسن سے جھمکے ہے سب میں نور
شمعِ حرم ہو یا کہ دِیا سومنات کا

بالذّات ہے جہاں میں وہ موجود ہر جگہ
ہے دید، چشمِ دل کے کھلے عینِ ذات کا

کیا میر تجھ کو نامہ سیاہی کا فکر ہے
ختمِ رسل سا شخص ہے ضامن نجات کا

لذّت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا
کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا

تھا ناز بہت ہم کو دانست پر اپنی بھی
آخر وہ بُرا نکلا ہم جس کو بھلا جانا

ہے میرے ترے نسبت رُوح اور جسد کی سی
کب آپ سے میں تجکو اے جان جدا جانا

ہائے خطاب کیا کیا دیکھے عتاب کیا کیا
دل کو لگا کے ہم نے کھینچے عذاب کیا کیا

کچھ گل سے ہیں شگفتہ کچھ سرو سے ہیں قدکش
اُس کے خیال میں ہم دیکھے ہیں خواب کیا کیا

انواعِ جُرم میرے پھر بے حساب و بے حد
روزِ حساب لیں گے مجھ سے حساب کیا کیا

پھر بھر گیا ہے آ کر مُنہ تک جگر ہمارے
گزرے ہیں جان و دل پر یاں اضطراب کیا کیا

کچھ سُوجھتا نہیں ہے مستی میں میرجی کو
کرتے ہیں پوچ گوئی پی کر شراب کیا کیا

طرزِ نگاہ اُس کی دل لے گئی سبھوں کے
کیا مومن و برہمن کیا گبر اور ترسا
تم واقفِ طریقِ بے طاقتی نہیں ہو
یاں راہِ دو قدم ہے اب دُور کا سفر سا
انداز سے ہے پیدا اسب کچھ خبر ہے اُس کو
گو میرؔ بے سر و پا ظاہر ہے بے خبر سا

تیغِ ستم سے اُس کی مرا سر جُدا ہوا
شکرِ خدا کہ حقِ محبت ادا ہوا
اُس کے گئے یہ دل کی خرابی نہ پوچھیے
جیسے کسو کا کوئی نگر ہو لُٹا ہوا
قاصد کو دے کے خط نہیں کچھ بھیجنا ضرور
جاتا ہے اب تو جی ہی ہمارا چلا ہوا

عزت بھی بعدِ ذلتِ بسیار چھیڑ ہے
مجلس میں جب خفیف کیا پھر ادب ہے کیا
کیونکر تمھاری بات کرے کوئی اعتبار

ظاہر میں کیا کہو ہو، سخن زیر لب ہے کیا
اُس مہ بغیر میرؔ کا مرنا عجب ہوا
ہر چند مرگِ عاشقِ مسکیں عجب ہے کیا

جھمکی دکھا کے طور کو جن نے جلا دیا
آئی قیامت اُن نے جو پردہ اُٹھا دیا
اب بھی دماغِ رفتہ ہمارا ہے عرش پر
گو آسماں نے خاک میں ہم کو ملا دیا

بہتوں کو آگے تھا یہی آزار عشق کا
جیتا رہا ہے کوئی بھی بیمار عشق کا؟
چھوٹا جو مر کے، قیدِ عبارات میں پھنسا
القصہ کیا رہا ہو گرفتار عشق کا

ستم سے گو ترے یہ کُشتۂ جفا نہ رہا
رہے جہان میں تُو دیر، میں رہا نہ رہا
کب اُس کا نام لیے غش نہ آگیا مجھکو

دلِ ستم زدہ کس وقت اُس میں جا نہ رہا
ملانا آنکھ کا ہر دم فریب تھا، دیکھا
پھر ایک دم میں وہ بے دید آشنا نہ رہا
حمیت اس کے تئیں کہتے ہیں جو میرؔ میں تھی
گیا جہاں سے پہ تیری گلی میں آ نہ رہا

ہے ابر کی چادر شفقی جوش سے گل کے
میخانے میں جا دیکھیے یہ رنگ ہوا کا
تدبیر تھی تسکیں کے لیے لوگوں کی، ورنہ
معلوم تھا مدّت سے ہمیں نفع دوا کا

عالم کی سیر میرؔ کی صحبت میں ہو گئی
طالع سے میرے ہاتھ یہ بے دست و پا لگا

ایک سا عالم نہیں رہتا ہے اس عالم کے بیچ
اب جہاں کوئی نہیں یاں ایک عالم ہو گیا
اُس لبِ جاں بخش کی حسرت نے مارا جان سے

آبِ حیواں یمنِ طالع سے مرے سم ہو گیا

معلوم تیرے چہرۂ پُر نُور کا سا لطف
بالفرض آسماں پہ گیا پھول، مُنہ ہوا

پُہنچے ہے کوئی اُس تنِ نازک کے لطف کو
گو گُل چمن میں جامے سے اپنے نکل پڑا
تھے اختلال گرچہ مزاجوں میں کب سے لیک
ہلنے میں اُس پلک کے نہایت خلل پڑا

دل فرطِ اضطراب سے سیماب سا ہوا
چہرہ تمام زَرد زرِ ناب سا ہوا
سمجھے تھے ہم تو میرؔ کو عاشق اُسی گھڑی
جب نام تیرا سُن کے وہ بیتاب سا ہوا

دیکھ آرسی کو یار ہوا محو ناز کا
خانہ خراب ہو جیو آئینہ ساز کا

ہوتا ہے کون دست بسر واں غرور سے
گالی ہے اب جواب سلامِ نیاز کا

ہے کیمیا گرانِ محبت میں قدرِ خاک
پر وقر کچھ نہیں ہے دلِ بے گداز کا

اس لطف سے نہ غنچۂ نرگس کھلا کبھو
کِھلنا تو دیکھ اُس مژۂ نیم باز کا

کوتاہ تھا فسانہ جو مرجاتے ہم شتاب
جی پر وبال سب ہے یہ عمرِ دراز کا

ہلتی ہے یوں پلک کہ گڑی دل میں جائے ہے
انداز دیدنی ہے مرے دل نواز کا

پھر میرؔ آج مسجدِ جامع کے تھے امام
داغِ شراب دھوتے تھے کل جانماز کا

غم ابھی کیا محشرِ مشہور کا شور سا ہے تو ولیکن دُور کا

ق

مر گئے پر خاک ہے سب کبر و ناز مت جھکو سر گو کسی مغرور کا
ٹھیکرے کو قدر ہے اُس کو نہیں ٹوٹے جب کاسہ سرِ فغفور کا

نظر میں طور رکھو اُس کم نما کا
بھروسا کیا ہے عمرِ بے وفا کا
گلوں کے پیرہن ہیں چاک سارے
کھلا تھا کیا کہیں بند اُس قبا کا
مروّت چشم رکھنا سادگی ہے
نہیں شیوہ یہ اپنے آشنا کا

خدا کی اوڑ سے یہ اعتبار ہے، ورنہ
جو خوب دیکھو تو میں کچھ ہنر نہیں رکھتا
جُدا جُدا پھرے ہے میر سب سے کس خاطر
خیال ملنے کا اُس کے اگر نہیں رکھتا

گیا میں جان سے وہ بھی جو ٹک آتا تو کیا ہوتا
قدم دو ساتھ میری نعش کے جاتا تو کیا ہوتا
پھرا تھا دور اُس سے مدّتوں میں کوہ و صحرا میں
بلا کر پاس اپنے مجکو بٹھلاتا تو کیا ہوتا
ہوے آخر کو سارے کام ضائع ناشکیبی سے
کوئی دن اور تابِ ہجر دل لاتا تو کیا ہوتا

ق ہم سے بے تکلف اُس کا چلا جاے ہے وہی
کل راہ میں ملا تھا سو مُنہ ڈھانپ کر چلا
یہ چھیڑ دیکھ، ہنس کے رُخِ زرد پر مرے
کہتا ہے میرؔ رنگ تو اب کچھ نکھر چلا

کس وقت شرحِ حال سے فرصت ہمیں ہوئی
کس دن نیا نہ قاصد ادھر سے چلا کیا

اس موج خیز دہر میں تو ہے حباب سا
آنکھیں کھُلیں تری تو یہ عالم ہے خواب سا
وہ دل کہ تیرے ہوتے رہا تھا بھرا بھرا
اب اُس کو دیکھیے تو ہے اک گھر خراب سا
یہ ہے فریبِ شوق کہ جاتے ہیں خط چلے
واں سے وگرنہ کب کا ہوا ہے جواب سا
مُدّت ہوئی کہ دل سے قرار و سکوں گئے
رہتا ہے اب تو آٹھ پہر اضطراب سا
مزاج آب سا ہے ولیکن اُڑے ہے خاک

ہے میرؔ بحرِ بے تہ ہستی سراب سا

اسباب مہیا تھے سب مرنے ہی کے لیکن
اب تک نہ مُوے ہم جو' اندیشہ کفن کا تھا
سب سطح ہے پانی کا آئینے کا سا تختہ
دریا میں کہیں شاید عکس اُس کے بدن کا تھا
خُوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو اپنا تھا باشندہ دکن کا تھا

یہ روش ہے دلبروں کی نہ کسو سے ساز کرنا
کوئی خاک سے ہو یکساں وہی اُن کو ناز کرنا
یہ بھی طرفہ ماجرا ہے کہ اُسی کو چاہتا ہوں
مجھے چاہیئے ہے جس سے بہت احتراز کرنا
یہی میرؔ قشقہ کھینچے درِ دیر پہ تھے ساجد
نہیں اعتماد قابل انھوں کا نماز کرنا

اک آن اس زمانے میں یہ دل نہ وا ہوا

کیا جانیئے کہ میر زمانے کو کیا ہوا
از خویش رفتہ میں ہی نہیں اُس کی راہ میں
آتا نہیں ہے پھر کے اُدھر کا گیا ہوا
دیکھا نہ ایک گل کو بھی چشمک زنی میں ہائے
جب کچھ رہا نہ باغ میں تب میں رہا ہوا
جس شعر پر سماع تھا کل خانقاہ میں
وہ آج میں سُنا تو ہے میرا کہا ہوا

نیمچہ ہاتھ میں مستی سے لہو سی آنکھیں
سج تری دیکھ کر اے شوخ حذر ہم نے کیا
جیسے حسرت لیے جاتا ہے جہاں سے کوئی
آہ یوں کوچۂ دلبر سے سفر ہم نے کیا

وصل و ہجراں سے نہیں ہے عشق میں کچھ گفتگو
لاگ دل کی چاہیے ہے یاں قریب و دور کیا
ہو خرابی اور آبادی کی عاقل کو تمیز
ہم دوانے ہیں ہمیں ویران کیا معمور کیا

شب میکدے سے وارِدِ مسجد ہوا تھا میں
پر شکر ہے کہ صُبح تئیں بے خبر رہا

اب چھیڑ یہ رکھی ہے کہ پوچھے ہے بار بار
کچھ وجہ بھی کہ آپ کا مُنہ ہے اُتر رہا

جلوہ ترا تھا جب تئیں باغ و بہار تھا
اب دل کو دیکھتے ہیں تو صحرا سا ہو گیا

عشق کی سوزش نے دل میں کچھ نہ چھوڑا کیا کہیں
لگ اُٹھی یہ آگ ناگاہی کہ گھر سب پُھک گیا

پھرتا ہے زندگی کے لیے آہ خوار کیا
اس وہم کی نمود کا ہے اعتبار کیا

کیا جانیں ہم اسیرِ قفس زاد اے نسیم
گل کیسے؟ باغ کہتے ہیں کس کو؟ بہار کیا

آنکھیں برنگِ نقشِ قدم ہو گئیں سفید
پھر اُدھر کوئی اُس کا کرے انتظار کیا

عاشق کے دل سے رکھ نہ تسلّی کی چشم داشت
ہے برق پارہ یہ اسے آ دے قرار کیا
صحبت رہی بگڑتی ہی اُس کینہ وَر سے آہ
ہم جانتے نہیں ہیں کہ ہوتا ہے پیار کیا
پاتے ہیں اپنے حال میں مجبور سب کو ہم
کہنے کو اختیار ہے' پر اختیار کیا
آخر زمانہ سازی سے کھویا نہ وَقرِ میرؔ
یہ اختیار تم نے کیا روزگار کیا

غنچہ ہی وہ دہان ہے گویا — ہونٹ پر رنگِ پان ہے گویا
سر بسر کیں ہے لیک وہ بُرکا — دیکھو تو مہربان ہے گویا
حیرتِ رُوے گُل سے مرغِ چمن — چپ ہے یوں بے زبان ہے گویا
مسجد ایسی بھری بھری کب ہے — میکدہ اک جہان ہے گویا
بسکہ ہیں اس غزل میں شعر بلند — یہ زمین آسمان ہے گویا
وہی شورِ مزاج شیب میں ہے — میرؔ اب تک جوان ہے گویا

ان سختیوں میں کس کا میلان خواب پر تھا

بالیں کی جاے ہر شب یاں سنگ زیرِ سر تھا
تیشے سے کوہکن کے کیا طرفہ کام نکلا
اپنے تو ناخنوں میں اس طور کا ہنر تھا
عصمت کو اپنی روتے واں تو ملک پھرے ہیں
لغزش ہوئی جو مجھ سے، کیا عیب، مَیں بشر تھا
کل ہم وہ دونوں یک جا ناگاہ ہو گئے تھے
وہ جیسے برقِ خاطف، مَیں جیسے ابرِ تر تھا
ہوش اُڑ گئے سبھوں کے شورِ سحر سے اُس کے
مرغِ چمن اگرچہ اک مشتِ بال و پر تھا
ہشیاری اُس کی دیکھو کیفی ہو مجکو مارا
تا سُن کے سب کہیں یہ وہ مست و بے خبر تھا
جب نالہ کش ہوا وہ تب مجلسیں رُلائیں
تھا میرؔ دل شکستہ یا کوئی نوحہ گر تھا

تیغ لے کر کیوں تو عاشق پر گیا
زیرِ لب جب کچھ کہا وہ مر گیا
کیا بندھا ہے اُس کے کوچے میں طلسم

پھر نہ آیا جو کوئی اودھر گیا
کہتے ہیں ضائع کیا اپنے تئیں
میر تو دانا تھا، یہ کیا کر گیا

جی رُک گئے اے ہمدم، دل خون ہو بھر آیا
اب ضبط کریں کب تک، مُنہ کو تو جگر آیا
تھی چشم دمِ آخر وہ دیکھنے آوے گا
سو آنکھوں میں جی آیا پر وہ نہ نظر آیا
ہر خستہ ترا خواہاں اک زخمِ دگر کا تھا
کی مشقِ ستم تو نے پر خون نہ کر آیا
صنعت گریاں ہم نے کیں سیکڑوں یاں لیکن
جس سے وہ کبھو ملتا، ایسا نہ ہنر آیا

یار ہے میر کا مگر گُل سا — کہ سحر نالہ کش ہے بلبل سا
کب تھی جُرأت رقیب کی اتنی — تم نے بھی کچھ کیا تغافل سا
اک نگہ، ایک چشمک، ایک سخن — اس میں بھی ہم کو ہے تامل سا
ٹوٹی زنجیرِ پائے میر مگر — رات سُنتے رہے ہیں ہم غل سا

چمن میں جا کے جو ہیں گرمِ وصفِ یار ہوا
گل اشتیاق سے میرے گلے کا ہار ہوا
ہماری خاک پر اک بیکسی برستی ہے
ادھر سے ابر جب آیا تب اشکبار ہوا

ایک دل کو ہزار داغ لگا — اندرونی میں جیسے باغ لگا
اُس سے یوں گل نے رنگ پکڑا ہے — شمع سے جیسے لیں چراغ لگا
میرؔ اُس بے نشاں کو پایا جان — کچھ ہمارا اگر سراغ لگا

تیغ کی اپنی صفت لکھتے جو کل وہ آ گیا
ہنس کے اُس پرچے کو میرے ہی گلے بندھوا گیا
داغِ محجوبی ہوں اُس کا میں کہ میرے روبرو
عکس اپنا آرسی میں دیکھ کر شرما گیا

دل عشق میں خوں دیکھا آنکھوں کو گیا دیکھا
پیغمبرِ کنعاں نے دیکھا نہ کہ کیا دیکھا
مجروح ہے سب سینہ تس پر ہے نمک پاشی

آنکھوں کے لڑانے کا ہم خوب مزا دیکھا
جی دیتے ہیں مرنے پر سب شہرِ محبت میں
کچھ ساری خدائی سے یہ طور نیا دیکھا
کہہ دل کو گنوایا ہے یا رنج اُٹھایا ہے
اے میرؔ تجھے ہم نے کچھ آج خفا دیکھا

گرم مجھ سوختہ کے پاس سے جانا کیا تھا
آگ لینے مگر آئے تھے، یہ آنا کیا تھا
دیکھنے آئے دمِ نزع لیے مُنہ پہ نقاب
آخری وقت میں یہ مُنہ کا چھپانا کیا تھا

واردِ گلشن غزل خواں میں جو دل بریاں ہوا
دامنِ گل گریۂ خونیں سے سب افشاں ہوا
تھا جگر میں جب تلک قطرہ ہی تھا خوں کا سرشک
اب جو آنکھوں سے تجاوز کر چلا طوفاں ہوا
اُس کے میرے بیچ میں آئینہ آیا تھا، ولے
صورتِ احوال ساری دیکھ کر حیراں ہوا

دل نے خوں ہو عشقِ خوباں میں بھی کیا بدلے ہیں رنگ
چہروں کا غازہ ہوا، ہونٹوں کا رنگِ پاں ہوا
جب سے ناموسِ جنوں گردن بندھا ہے تب سے میرؔ
جیبِ جاں وابستۂ زنجیرِ تا داماں ہوا

آیا ہے ابر گھر کر قبلے سے تیرہ تیرا
مستی کے ذوق میں ہیں آنکھیں بہت ہی خیرا
مجنوں نے حوصلے سے دیوانگی نہیں کی
جاگہ سے اپنی جانا اپنا نہیں وتیرا
آئینے کو بھی دیکھو، پر ٹک ادھر بھی دیکھو
حیران چشمِ عاشق دیکھے ہے جیسے ہیرا
غیرت سے میرؔ صاحب سب جذب ہو گئے تھے
نکلا نہ بوند لوہو، سینہ جو اُن کا چیرا

یاں اپنی آنکھیں پھر گئیں پر وہ نہ آ پھرا
دیکھا نہ بدگمان ہمارا بھلا پھرا
طالع پھرے، سپہر پھرا، قلب پھر گئے

چند ہے وہ رشکِ ماہ جو ہم سے جُدا پھرا
بندہ ہے پھر کہاں کا جو صاحب ہوئے دماغ
اُس سے خدائی پھرتی ہے جس سے خدا پھرا
خانہ خراب میرؔ بھی کتنا غیور تھا!
مرتے موا پر اُس کے کبھو گھر نہ جا پھرا

عشق نے کیا کیا تصرف یاں کیے ہیں آجکل
چشم کو پانی کیا سب، دل کو سب لوہو کیا
کام میں قدرت کے کچھ بولا نہیں جاتا ہے، ہائے
خُوب رُو اُس کو کیا لیکن بہت بد خُو کیا
جانا اُس آرامگہ سے ہے بعینہ بس یہی
جیسے سوتے سوتے ایدھر سے اُدھر پہلو کیا
پھول نرگس کا لیے بھیک کھڑا تھا راہ میں
کس کی چشمِ پُرفسوں نے میرؔ پہ جادو کیا

عاشق ترے لاکھوں ہوئے مجھسا نہ پھر پیدا ہوا
تجھپر کوئی اے کامِ جاں دیکھا نہ یوں مرتا ہوا

مُدّت ہوئی اُلفت کیے، برسوں ہوئے طاقت گئے
دل مضطرب ایسا نہ تھا، کیا جانیے اب کیا ہوا
کتنوں کے دل بے جا ہوئے، کتنے نہ جانا کیا ہوئے
چلنے میں اُس کے دو قدم، ہنگامہ اک برپا ہوا
مستی میں لغزش ہو گئی معذور رکھا چاہیے
اے اہلِ مسجد اس طرف آیا ہوں میں بہکا ہوا
جو حُسن ہے اک فتنہ گر، تو عشق بھی ہے پردہ در
وہ شہرۂ عالم ہوا، میں خلق میں رُسوا ہوا

کہیں ٹھہرنے کی جا یاں نہ میں نے دیکھی میرؔ
چمن میں عالمِ امکاں کے جیسے آب پھرا

لے رنگِ بے ثباتی یہ گلستاں بنایا
بلبل نے کیا سمجھ کر یاں آشیاں بنایا
اُڑتی ہے خاک یا رب شام و سحر جہاں میں
کس کے غبارِ دل سے یہ خاکداں بنایا
اک رنگ یہ نہ رہنا یاں کا عجب نہیں ہے

کیا کیا نہ رنگ لائے تب یہ جہاں بنایا
آئینے میں کہاں ہے ایسی صفا، کہے تو
جنھوں سے راستوں کے وہ آستاں بنایا
نقشِ قدم سے اُس کے گلشن کی طرح ڈالی
گردِ رہ اُس کی لے کر سروِ رواں بنایا
ہونے پہ جمع اپنے بھولا بہت تھا، لیکن
کیا غنچہ تنگ آیا جب وہ دہاں بنایا
اس صحن پر یہ وسعت اللہ رے تیری صنعت
معمار نے قضا کے دل کیا مکاں بنایا
وہ تو مٹا گیا تھا تربت بھی میر جی کی
دو چار اینٹیں رکھ کر پھر میں نشاں بنایا

ہم عاجز دل پر آ کر یوں کوہِ غم گرا ہے
جیسے زمیں کے اوپر ایک آسمان مارا

ق
یہ میرِ ستم کشتہ کسو وقت جواں تھا

اندازِ سخن کا سببِ شور و فغاں تھا
جادو کہ پری، پرچۂ ابیات تھا اُس کا
مُنہ تکتے غزل پڑھتے عجب سحر بیاں تھا
جس راہ سے وہ دل زدہ دلّی میں نکلتا
ساتھ اُس کے قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا
افسردہ نہ تھا ایسا کہ جوں آب زدہ خاک
آندھی تھا، بلا تھا، کوئی آشوبِ جہاں تھا
کس مرتبہ تھی حسرتِ دیدار مرے ساتھ
جو پھُول مری خاک سے نکلا، نگراں تھا
غافل تھے ہم احوالِ دلِ خستہ سے اپنے
وہ گنج اسی کُنجِ خرابی میں نہاں تھا

عشق کو بیچ میں یارب تو نہ لایا ہوتا
یا تنِ آدمی میں دل نہ بنایا ہوتا
عزّتِ اسلام کی کچھ رکھ لی خدا نے، ورنہ
زُلف نے تیری تو زنار بندھایا ہوتا
دل سے خوش طرح مکاں پھر بھی کہیں بنتے ہیں

اس عمارت کو ٹک اک دیکھ کے ڈھایا ہوتا
کم کم اُٹھتا وہ نقاب، آہ کہ طاقت رہتی
کاش اک بار ہمیں مُنہ نہ دکھایا ہوتا
میؔر اظہارِ محبت میں گیا جی نہ ترا
ہائے نادان بہت تو نے چھپایا ہوتا

ایک ڈھیری راکھ کی تھی صبح جائے میؔر پر
برسوں سے جلتا تھا شاید رات جل کر رہ گیا

طریق خوب ہے آپس میں آشنائی کا
نہ پیش آوے اگر مرحلہ جُدائی کا
یہیں ہیں دیر و حرم، اب تو یہ حقیقت ہے
دماغ کس کو ہر اک دَر کی جبہ سائی کا
رکھا ہے باز ہمیں در بدر کے پھرنے سے
یہ اپنے نشہ ہے احسان شکستہ پائی کا

یہ رفتگی بھی ہوتی ہے، جی ہی چلا گیا

کل حالِ میؔر دیکھ کے غش مجکو آ گیا
نالاں ہے عندلیب، گل آشفتہ، رفتہ سرو
تکسے بیٹھ کر چمن میں وہ فتنہ اُٹھا گیا
آنسو تو ڈر سے پی گئے، لیکن وہ قطرۂ آب
اک آگ تن بدن میں ہمارے لگا گیا
وقتِ اخیر کیا یہ ادا تھی کہ غش سے میں
جب آنکھ کھولی بالوں میں مُنہ کو چھپا گیا

تھا لطفِ زیست جن سے وے اب نہیں میؔر
مُدت ہوئی کہ ہم نے جلینے سے ہاتھ اُٹھایا

نکتہ مشتاق یار ہے اپنا — شاعری یوں شعار ہے اپنا
بے خودی لے گئی کہاں ہم کو — دیر سے انتظار ہے اپنا
روتے پھرتے ہیں ساری ساری رات — اب یہی روزگار ہے اپنا
دے کے دل ہم جو ہو گئے مجبور — اس میں کیا اختیار ہے اپنا

کیوں کر نہ مر رہے جو بے تاب میؔر سا ہو

ایک آدھ دن تو گھر سے دل تھام تھام نکلا

کیا کہیں کچھ کہا نہیں جاتا
اور چُپ بھی رہا نہیں جاتا
طاقتِ دل تلک تعب کھینچے
اب ستم ٹک سہا نہیں جاتا
اُس دُرِ تر کا حیرتی ہے بحر
تب تو اُس سے بہا نہیں جاتا
کب تری رہ میں میرِ گرد آلود
لوہو میں آنہا نہیں جاتا

پس از عمر اودھر گئی تھی نگاہ
سو آنکھیں وہ مجکو دکھانے لگا
نہیں رہتے عاقل علاقے بغیر
کہیں میر دل کو دوانے لگا

اللہ رے غرور و ناز تیرا
مطلق نہیں مجھ سے ساز تیرا
کچھ عشق و ہوس میں فرق بھی کر
کیدھر ہے وہ امتیاز تیرا

وصیت میر نے مجکو یہی کی
کہ سب کچھ ہونا تو عاشق نہ ہونا

اب وہ جگر تپش سے تڑپتا ہے تشنہ لب
مُدت تلک جو میر کا لوہو پیا کیا

صد شکر کہ داغِ دل افسردہ ہوا، ورنہ
یہ شعلہ بھڑکتا تو گھر بار جلا جاتا
کہتے تو ہو، یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا
یہ کہنے کی باتیں ہیں، کچھ بھی نہ کہا جاتا
گر عشق نہیں ہے تو یہ کیا ہے بھلا مجکو
جی خود بخود اے ہمدم کاہے کو کھپا جاتا

جو کچھ نظر پڑے ہے حقیقت میں کچھ نہیں
عالم میں خوب دیکھو تو عالم ہے خواب کا
دریا دلی جنھیں ہے نہیں ہوتے کاسہ لیس
دیکھا ہے واژگوں ہی پیالہ حباب کا
شاید کہ قلبِ یار بھی ٹک اس طرف پھرے
میں منتظر زمانے سے ہوں انقلاب کا
بے ہوش دیکھ آگے مرے ساتھ غیر کے
رکھتا ہے پاؤں مست ہو جیسے شراب کا
لائق تھا ریجھنے ہی کے مصرعِ قدِ یار
میں معتقد ہوں میرؔ ترے انتخاب کا

بعد مدت اس طرف لایا تھا اُس کو جذبِ عشق
بخت کی برگشتگی سے آتے آتے پھر گیا

طاقت سے میرے دل کی خبر تجھ کو کیا نہ تھی
ظالم نگاہِ خشم ادھر کی غضب کیا
بچھڑے تمہارے اپنا عجب حال ہو گیا
جس کی نگاہ پڑ گئی اُن نے عجب کیا

مجھ مست کو کیا نسبت اے میر مسائل سے
مُنہ شیخ کا مسجد میں مَیں رکھ کے مسل ڈالا

بہتوں نے چاہا کہیے پہ کوئی نہ کہہ سکا
احوال عاشقی کا مری گو مگو رہا

پڑ گئیں آنکھیں اُٹھائی دل نے چوٹ
یہ تماشائی عبث گھائل ہوا

ناشکیبی سے گئی ناموسِ فقر
عاقبت بو سے کا میں سائل ہوا

ایک تجھ سے ہم تو نہ ہوتے مست آگے
اپنا ہونا بیچ میں حائل ہوا

کوئی فقیر یہ اے کاشکے دعا کرتا
کہ مجکو اُس کی گلی کا خدا گدا کرتا
چمن میں پھول گل اب کے ہزار رنگ کھلے
دماغ کاشکے اپنا بھی ٹک وفا کرتا
بدی نتیجہ ہے نیکی کا اس زمانے میں
بھلا کسو سے جو کرتا تو تُو برا کرتا

کوئی سادہ ہی اُس کو سادہ کہے لگے ہے ہمیں تو وہ عیّار سا
محبت ہے یا کوئی جی کا ہے روگ سدا میں تو رہتا ہوں بیمار سا
مگر آنکھ تیری بھی چپکی کہیں ٹپکتا ہے چتون سے کچھ پیار سا
نہیں میرؔ مستانہ صحبت کا باب مصاحب کرو کوئی ہشیار سا

حیراں ہے لحظہ لحظہ طرزِ عجب عجب کا
جو رفتۂ محبت واقف ہے اُس کے ڈھب کا
کہتے ہیں کوئی صورت بن معنی یاں نہیں ہے
یہ وجہ ہے کہ عارف منہ دیکھتا ہے سب کا
افسوس ہے، نہیں تو انصاف دوست و نہ

شایانِ لطفِ دشمن، شایستہ ہیں غضب کا
کیا آج کل سے اُس کی یہ بے توجہی ہے؟
مُنہ اُن نے اس طرف سے پھیرا ہے تیر کب کا

وائے احوال اُس جفاکش کا — عاشق اپنا جسے وہ جان گیا
کل نہ آنے میں ایک ہاں تیر ہے — آج سو سو طرف گمان گیا
دل سے مت جا کہ پھر وہ پچھتایا — ہاتھ سے جس کے یہ مکان گیا

ہنگامِ شرحِ غمِ جگر، خامہ شق ہوا
سوزِ دروں سے نامہ کباب ورق ہوا
بندہ خدا ہے پھر تو، اگر گزرے آپ سے
مرتا ہے جو کوئی اُسے کہتے ہیں حق ہوا
دل میں رہا نہ کچھ تو کیا ہم نے ضبطِ شوق
یہ شہر جب تمام لُٹا تب نسق ہوا
وہ رنگ وہ روش وہ طرح سب گئی بباد
آتے ہی تیرے باغ میں مُنہ گل کا فق ہوا
برسوں تری گلی میں چمن ساز جو رہا

وہ دیدہ اب گداختہ ہو کر شفق ہوا
اس نہ ورق میں تیر جو تھا شرح و بسط سے
بیٹھا جو لے کے میں تو مرا اک ورق ہوا

کل میں کہا وہ طور کا شعلہ کہاں گرا
دل نے جگر کی اُور اشارت کی ہاں گرا
پہنچایا مجکو عجز نے مقصودِ دل کے تئیں
یعنی کہ اُس کے در ہی پہ میں ناتواں گرا

تڑپے ہے جبکہ سینے میں اُچھلے ہے دو دو ہاتھ
گر دل یہی ہے میر تو آرام ہو چکا

عالم میں جاں کے مجکو تنزہ تھا اب تو میں
آلودگیٔ جسم سے ماٹی میں اَٹ گیا
اب وہ سماں نہیں ہے کہ وہ کام جاں بہ حلق
مغموم مجکو دیکھ کے دوڑا لپٹ گیا
داماں و جیب دونوں ہوئے ٹکڑے ایک جا

اب کے یہ کام ہاتھ سے میرے سمٹ گیا

سینے میں شوقِ میر کے سب درد ہو گیا
دل پر رکھا تھا ہاتھ، سو منہ زرد ہو گیا

کیا تو، نمود کس کی، کیسا کمال تیرا
اے نقشِ وہم آیا کیدھر خیال تیرا
پہلا قدم ہے انساں پامالِ مرگ ہونا
کیا جانیے رفتہ رفتہ کیا ہو مآل تیرا
ہوگی جو چُھل سر سو پنہاں نہیں رہے گی
اک دن زبان ہوگا ایک ایک بال تیرا
کچھ زرد زرد چہرہ، کچھ لاغری بدن میں
کیا عشق میں ہوا ہے اے میر حال تیرا

قفس کے چاک سے دیکھوں ہوں میں تو تنگ آتا ہوں
چمن میں غنچہ ہو آنا گلوں پر ہمصفیروں کا
ہمارے دیکھتے زیرِ نگیں تھا ملک سب جن کے

کوئی اب نام بھی لیتا نہیں اُن ملک گیروں کا

ہوئیں رسوائیاں جس کے لیے چھوٹا دیار اپنا
ہوا وہ بے مروّت بے وفا ہرگز نہ یار اپنا
خدا جانے ہمیں اس بیخودی نے کس طرف پھینکا
کہ مُدّت ہوگئی ہم کھینچتے ہیں انتظار اپنا
ذلیل اُس کی گلی میں ہر تیء ہوں آزردگی کیسی
کہ رنجش اُس جگہ ہووے جہاں ہوا اعتبار اپنا
عجب ہم بے بصیرت ہیں کہاں کھولا ہے بار آکر
جہاں سے لوگ سب رختِ سفر کرتے ہیں بار اپنا

ربطِ دل زُلف سے اُس کی جو نہ پنہاں ہوتا
اس قدر حال ہمارا نہ پریشاں ہوتا
میری زنجیر کی جھنکار نہ کوئی سُنتا
شورِ مجنوں نہ اگر سلسلہ جنباں ہوتا
ہر سحر آئنہ رہتا ہے ترا مُنہ تکتا
دل کی تقلید نہ کرتا تو نہ حیراں ہوتا

وصل کے دن سے بدل کیونکے شبِ ہجراں ہو
شاید اس طور میں ایّام کا نقصاں ہوتا
میر بھی دَیر کے لوگوں ہی کی سی کہنے لگا
کچھ خدا لگتی بھی کہتا جو مسلماں ہوتا

آ گیا عشق میں جو پیش نشیب اور فراز
ہو کے ہیں خاک برابر اُسے ہموار کیا
نالۂ بلبلِ بے دل ہے پریشان بہت
موسمِ گل نے مگر رختِ سفر بار کیا

شکستہ دلِ عشق کی جان کیا نظر پھیر ہی تو نے تو وہ مر گیا

فردا کا سوچ تجکو کیا آج ہی پڑا ہے
کل کی سمجھیو کل ہی کل تو اگر رہے گا

کب کھپا جاتا تھا یوں آنکھوں میں جیسا صبح تھا
پھول خوش رنگ اِدھر اُس کے فرش پر جھکر ہوا

جل گیا یاقوت اُس کے لعلِ لب جب ہل گئے
گوہرِ خوش آب انداز سخن سے تر ہوا

کبھو تو دَیر میں ہوں میں، کبھو ہوں کعبے میں
کہاں کہاں لیے پھرتا ہے شوق اُس در کا
بتا کے کعبے کا رستا اُسے بھلاؤں راہ
نشاں جو پوچھے کوئی مجھ سے یار کے گھر کا
نہ ترکِ عشق جو کرتا تو میرؔ کیا کرتا
جفا کشی نہیں ہے کام نازپرور کا

اُس مہ سے دل کی لاگ وہی متصل رہی
گو چرخ نے بصورتِ ظاہر جدا رکھا

مَیں جوانی میں مَے پرست رہا — گردنِ شیشہ ہی میں دست رہا
درِ میخانہ ہی میں مرے سر پہ — ظلِ ممدود و دار بست رہا
میرؔ کے ہوش کے ہیں ہم عاشق — فصلِ گُل جب تلک تھی مست رہا

چمن بھی ترا عاشقِ زار تھا — گلِ وَرد اک زرد رخسار تھا
یہی جنس دل کی گراں قدر تھی — ولے جب تلک تُو خریدار تھا
بہت روئے ہم شبنم و گل کو دیکھ — کہ چھپاں ہمیں بھی کہیں پیار تھا

اندوہ و غم کے جوش سے دل رُک کے خوں ہوا
اب کے مجھے بہار سے آگے جنوں ہوا
نخچیر گاہِ عشق میں افراطِ صید سے
رُوح الامیں کا نام شکارِ زبوں ہوا
ہوں داغ نازکی کہ کیا تھا خیالِ بوس
گلبرگ سا وہ ہونٹ جو تھا نیلگوں ہوا
میرؔ اُن نے سرگذشت سُنی ساری بات کو
افسانہ عاشقی کا ہماری فسوں ہوا

ہستی ہے اپنے طور پہ جوں بحر جوش میں
گرداب کیسا، موج کہاں ہے، حباب کیا
دیکھا پلک اُٹھا کے تو پایا نہ کچھ اثر
اے عمرِ برقِ جلوہ گئی تو شتاب کیا

ہرچند میر بستی کے لوگوں سے ہے نفور
پر ہائے آدمی ہے وہ خانہ خراب کیا

اے اُنکیلے یہ تھی کہاں کی ادا | کھُب گئی جی میں تیری بانکی ادا
جادُو کرتے ہیں اک نگاہ کے بیچ | ہائے رے چشمِ دلبراں کی ادا
بات کہنے میں گالیاں دے ہے | سُنتے ہو میرے بدزباں کی ادا
دل چلے جائے ہیں خرام کے ساتھ | دیکھی چلنے میں ان بتاں کی ادا
خاک میں مل کے میر ہم سمجھے | بے ادائی تھی آسماں کی ادا

رہا میں تو عزت کا اعزاز کرتا | چلا عشق خواری کو ممتاز کرتا
نہ ہوتا میں حیرت میں محتاجِ گریہ | جو کچھ آنسوؤں کو میں انداز کرتا
تُو تمکین سے کچھ نہ بولا۔ وگرنہ | مسیحا صنم ترکِ اعجاز کرتا

عیدِ آئندہ تک رہے گا گلا | ہو چکی عید تُو گلے نہ ملا

خلطہ ہمارا اُس کا حیرت ہی کی جگہ ہے
ڈھونڈھا جہاں ہم اُس کو واں آپ ہی کو پایا

آنکھیں کھلیں تو دیکھا جو کچھ نہ دیکھنا تھا
خوابِ عدم سے ہم کو کاہے کے تئیں جگایا

نہ تو آوے نہ جاوے بے قراری
یوں ہی اک دن، سُنا، میں مر رہوں گا
ترے غم کے ہیں خواہاں سب، نہ کھا غم
کمی کیا ہوگی جو اک میں نہ ہوں گا

اے تپش لوہو پیے میرا جو تو جھوٹ کہے
کس سے یہ قاعدہ سیکھا ہے لہو پینے کا
اس میں حیران ہوں کس کس کا گلہ تجھ سے کروں
بدگمانی کہ تغافل کہ ترے کینے کا
میر کی نبض پہ رکھ ہاتھ لگا کہنے طبیب
آج کی رات یہ بیمار نہیں جینے کا

عشق سے دل میں تازہ داغ جلا اس سیہ خانے میں چراغ جلا

ردیف:- ب

اندوہ سے ہوئی نہ رہائی تمام شب
مجھ دل زدہ کو نیند نہ آئی تمام شب
تارے سے میری پلکوں پہ قطرے سرشک کے
دیتے رہے ہیں میرؔ دکھائی تمام شب

داغ ہو جلتا ہے دل بے طوَر اب
دیکھیے کیا گُل کھِلے ہے اَور اب
شعر پڑھتے پھرتے ہیں سب میرؔ کے
اس قلمرو میں ہے اُن کا دَوْر اب

جن و ملک زمین و فلک سب نکل گئے
بارِ گرانِ عشق و دلِ ناتواں ہے اب
نکلی تھی اُس کی تیغ موے خوش نصیب لوگ
گردن جھکائی میں تو سُنا یہ، اماں ہے اب

زردیٔ رنگ ہے غمِ پوشیدہ پر دلیل
دل میں جو کچھ ہے مُنہ سے ہمارے عیاں ہے اب
برسوں ہوے گئے ہوے پر بھولتا نہیں
یادش بخیر میرؔ رہے خوش جہاں ہے اب

سوزش بہت ہو دل میں تو آنسو کو پی نہ جا
کرتا ہے کام آگ کا ایسی جلن میں آب
دیکھو تو کس روانی سے کہتے ہیں شعر میرؔ
دُر سے ہزار چند ہے ان کے سخن میں آب

جیسا مزاج آگے تھا میرا سو کب ہے اب
ہر روز دل کو سوز ہے ہر شب کو تب ہے اب
طاقت کہ جس سے تابِ جفا تھی سو ہو چکی
تھوڑی سی کوفت میں بھی بہت سا تعب ہے اب
نے چاہ وہ اُسے ہے نہ مجکو ہے وہ دماغ
جانا مرا اُدھر کو لشرطِ طلب ہے اب
جاتا ہوں دن کو ملنے تو کہتا ہے دن ہے میرؔ

جو شب کو جاٸیے تو کہے ہے کہ شب ہے اب

عشاق کے تئیں ہے عجز و نیاز واجب
ہے فرض عین رونا، دل کا گداز واجب
ناسازی طبیعت ایسی پھر اُس کے اوپر
ہے ہر کسو سے مجکو ناچار ساز واجب
صرفہ نہیں ہے مطلق جانِ عزیز کا بھی
اے میرؔ تجھ سے ظالم ہے احتراز واجب

اس عمرِ برق جلوہ کی فرصت بہت ہے کم
جو کام پیش آوے تجھے اُس میں ہو شتاب
غفلت سے ہے غرور تجھے ورنہ ہے بھی کچھ
یاں وہ سماں ہے جیسے کہ دیکھے ہے کوئی خواب
یہ بستیاں اُجڑ کے کہیں بستیاں بھی ہیں!
دل ہو گیا خراب جہاں بس رہا خراب
بیتابیاں بھری ہیں مگر کوٹ کوٹ کر
خرقے ہیں جیسے برق ہمارے ہے اضطراب

کاش اُس کے رُو برُو نہ کریں مجکو حشر میں!
کتنے مرے سوال ہیں جن کا نہیں جواب
گزرے ہیں میر لوٹتے دن رات آگ میں
ہے سوزِ دل سے زندگی اپنی ہمیں عذاب

جو کہو تم سو ہے بجا صاحب — ہم بُرے ہی سہی بھلا صاحب
کس نے سُن شعرِ میر یہ نہ کہا — کہیو پھر ہائے کیا کہا صاحب

ہزاروں خواہشِ فرُو منے سرِ دل سے نکالا ہے
قیامت گی بہے ہے دیدہ کو ٹک عام کریے اب
بلا آشوب تھا گو بانِ بر آغازِ اُلفت میں
ہوا سو تو ہوا اندیشۂ انجام کریے اب
زبانِ خامہ کے چلتے ہزاروں اشک گرتے ہیں
حقیقت اپنے دل کی آہ کیا ارقام کریے اب

کچھ قدر عیش نہ جانی غفلت سے رفتگاں کی
آنکھیں سی کھل گئیں جب وے صحبتیں ہوئیں خواب

تھی چشم یہ رُکے گا پلکوں سے گریہ لیکن
ہوتی ہے بند کوئی تنکوں سے راہِ سیلاب

ق

تو بھی تو مختلط ہو سبزے میں ہم سے ساقی
لے کر بغل میں اپنی مینائے بادۂ ناب
نکلی ہیں ابکے کلیاں اس رنگ سے چمن میں
سر جوڑ جوڑ جیسے مل بیٹھتے ہیں احباب
کیا لعلِ لب کسو کے اے میر چت چڑھے ہیں
چہرے پہ تیرے ہر دم بہتا رہے ہے خوناب

ردیف - ت

دیر کچھ کھنچتی تو کہتے بھی ملاقات کی بات
ملنا اپنا جو ہوا اُس سے سو وہ بات کی بات

گفتگو شاہد و مَے سے ہے نہ غیبت نہ گلہ
خانقہ کی سی نہیں بات خرابات کی بات

مُنہ اِدھر، اور سخنِ زیرِ لبی غیر کے ساتھ
اُس فریبندہ کی ناگفتنی ہے گھات کی بات

یہ کسِ آشفتہ کی جمعیّتِ دل تھی منظور
بال بکھرے ترے مُنہ پر کہے ہیں رات کی بات

گفتگو وصفوں سے اُس ماہ کے کریے اے میر
کاہش افزا ہے کروں اُس کی اگر ذات کی بات

ہم تم سے چشم رکھتے تھے دلداریاں بہت
سو التفات کم ہے، دل آزاریاں بہت

دیکھیں تو کیا دکھائے یہ افراطِ اشتیاق

لگتی ہیں تیری آنکھیں ہمیں پیاریاں بہت

دیکھ خالی جا کہیں گے برسوں اہلِ روزگار
میر اکثر دل کا قصہ یاں کہا کرتا تھا رات

سرِ گُل نے پھر جُھکا کے اُٹھایا نہ شرم سے
گلزار میں چلی تھی کہیں اُس کے رُو کی بات
ہم سوختوں میں آتشِ سرکش کا ذکر کیا
چل بھی پڑی ہے بات تو اُس تُند خو کی بات

یوں بارِ گل سے اب کے جُھکے ہیں نہالِ باغ
جُھک جُھک کے جیسے کرتے ہیں دو چار یار بات

ہوتی ہے گرچہ کہنے سے یارو پرائی بات
پر ہم سے تو تھمی نہ کبھو مُنہ پر آئی بات
کہتے تھے اُس سے ملیے تو کیا کیا نہ کہیے لیک
وہ آگیا تو سامنے اُس کے نہ آئی بات

اب تو ہوے ہیں ہم بھی ترے ڈھب سے آشنا
واں تو نے کچھ کہا کہ ادھر ہم نے پائی بات

عالم سیاہ خانہ ہے کس کا کہ روز و شب
یہ شور ہے کہ دیتی نہیں کچھ سنائی بات

اک دن کہا تھا یہ کہ خموشی میں ہے وقار
سو مجھ سے ہی سخن نہیں مَیں جو بتائی بات

اب مجھ ضعیف و زار کو مت کچھ کہا کرو
جاتی نہیں ہے مجھ سے کسو کی اُٹھائی بات

خط لکھتے لکھتے میرؔ نے دفتر کیے رواں
افراطِ اشتیاق نے آخر بڑھائی بات

مستی میں شرمِ گنہ سے مَیں جو رویا ڈاڑھ مار
گر پڑا بےخود ہو واعظ جمعہ کو منبر سمیت

دل کی ویسی ہے خرابی کثرتِ اندوہ سے
جیسے رو پڑتا ہے دشمن کا کہیں لشکر بہت

دیکھ رُوے زرد پر میرے بھی آنسو کی ڈھلک

اے کہ تو نے دیکھی ہے غلطانیٔ گوہر محبت

ملامت گر نہ کر مجکو ملامت — جلے کو اَور تو اتنا جلا مت
بہت رونے نے رسوا کر دکھایا — نہ چاہت کی چھپی ہم سے علامت

ردیف :- چ

آگ سا تو جو ہوا اے گُلِ تر آن کے بیچ
صُبح کی باد نے کیا پھُونک دیا کان کے بیچ

ہم نہ کہتے تھے کہیں زُلف کہیں رُخ نہ دکھا
اختلاف آیا نہ ہندو و مسلمان کے بیچ

باوجودِ ملکیّت نہ ملک میں پایا
وہ تقدس کہ جو ہے حضرتِ انسان کے بیچ

دے پھری پلکیں اگر کھب گئیں جی میں تو وہیں
رخنے پڑ جائیں گے واعظ ترے ایمان کے بیچ

میرزائی کا کب اے میرؔ چلا عشق میں کام
کچھ تعب کھینچنے کو تاب تو ہو جان کے بیچ

سرسری مت جہاں سے جا غافل
پاؤں تیرا پڑے جہاں ٹک سوچ
ہونٹ اپنا ہلا نہ سمجھے بن

یعنی جب کھولے تو زباں ٹک سوچ
گل و رنگ و بہار پردے ہیں
ہر عیاں میں ہے وہ نہاں ٹک سوچ

کنعاں سے جا کے مصر میں یوسفؑ ہوا عزیز
عزّت کسو کی ہوتی نہیں ہے وطن کے بیچ
بلبل خموش، لالہ و گل دونوں زرد زرد
شمشاد محو، بے کلی اک نسترن کے بیچ
کل ہم بھی سیرِ باغ میں تھے ساتھ یار کے
دیکھا تو اور رنگ ہے سارے چمن کے بیچ

ق

یا ساتھ غیر کے ہے تمھیں ویسی بات چیت
سو سو طرح کے لطف ہیں ایک اک سخن کے بیچ
یا پاس میرے لگتی ہے چُپ ایسی آن کر
گویا زباں نہیں ہے تمھارے دہن کے بیچ
زہاد و قیس و میرؔ یہ آوارگانِ عشق
یوں ہی گئے ہیں سب کی رہی مَن کی مَن کے بیچ

توبہ صد بار کہ مَستی میں، پرو ڈالے ہیں
دانے تسبیح کے میں رشتۂ زُنّار کے بیچ

ردیف :۔ ح

آنے کی اپنے کیا کہیں اس گلستاں کی طرح
ہر گام پر تلف ہوے آبِ رواں کی طرح
یہ شورِ دل خراش کب اُٹھتا تھا باغ میں
سیکھی ہے عندلیب نے ہم سے فغاں کی طرح
نقشہ الٰہی دل کا مرے کون لے گیا
کہتے ہیں ساری عرش میں ہے اس مکاں کی طرح
لگ کر گلے سے اُس کے بہت میں بُکا کیا
ملتی تھی سروِ باغ میں کچھ اُس جواں کی طرح
جو کچھ نہیں تو بجلی ہی سے پھول پڑ گیا
ڈالی چمن میں ہم نے اگر آشیاں کی طرح

دَورِ گردوں سے ہوئی کچھ اَور میخانے کی طرح
بھر نہ آویں کیونکے آنکھیں میری پیمانے کی طرح
چشمکِ انجم میں اتنی دل کشی پہلے نہ تھی

سیکھی تاروں نے اُس کی آنکھ جھپکانے کی طرح

جان کا صرفہ نہیں ہے کچھ تجھے کُڑھنے میں میرؔ
غم کوئی کھاتا ہے میری جان غم کھانے کی طرح

ردیف :- د

اب دیکھنے میں پیارے ٹک تو بڑھا عنایت
کوتاہ تر پلک سے ایدھر نگاہ تاچند
عمرِ عزیز ساری منت ہی کرتے گزری
بے جُرم آہ رہیے، یوں عُذرخواہ تاچند

تجھ بن اے نوبہار کے مانند — چاک ہے دل انار کے مانند
پہنچی شاید جگر تک آتشِ عشق — اشک ہیں سب شرار کے مانند
کوئی نکلے کلی تو لالہ کی — اس دلِ داغدار کے مانند
برق تڑپی بہت ولے نہ ہوئی — اس دلِ بے قرار کے مانند
اُس کی سرتیز ہر پلک ہے میرؔ — خنجرِ آبدار کے مانند

کیا صحبتیں اگلی گئیں خاطر سے ہماری۔
اپنی بھی وفا یاد ہے اُس کی بھی جفا یاد
کعبے تو گئے بھول کے ہم دَیر کا رَستا

آتا تھا دے راہ میں ہر گام خدا یاد

اسیر کر کے نہ لی تو نے تو خبر صیّاد
اُڑا کیے مرے پر کالۂ جگر صیّاد
چمن کی یاد کے آتے خبر نہ اتنی رہی
کہ میں کدھر ہوں قفس ہے کدھر، کدھر صیّاد
اسیر میرؔ نہ ہوتے، اگر زباں رہتی
ہوئی ہماری یہ خوش خوانیٔ سحر صیّاد

سب پریشاں دلی میں شب گزری — بال اُس کے بکھر گئے شاید
کچھ خبر ہوتی تو نہ ہوتی خبر — صوفیاں بے خبر گئے شاید
لوہو آنکھوں میں اب نہیں آتا — زخم سب دل کے بھر گئے شاید

جُدائی کے حالات میں کیا کہوں — قیامت تھی ایک ایک ساعت کے بعد
موا کوہکن بے ستوں کھود کر — یہ راحت ہوئی ایسی محنت کے بعد
نظر میرؔ نے کیسی حسرت سے کی — بہت روئے ہم اُس کی رخصت کے بعد

ردیف: ر

رفتار میں یہ شوخی رحم اے جواں زمیں پر
لاتا ہے تازہ آفت تو ہر زماں زمیں پر

آنکھیں لگی رہیں گی برسوں وہیں سبھوں کی
ہوگا قدم کا تیرے جس جا نشاں زمیں پر

آتا نہ تھا فرو سر کل جن کا آسماں سے
ہیں ٹھوکروں میں اُن کے آج استخواں زمیں پر

جو کوئی یاں سے گزرا کیا آپ سے نہ گزرا
پانی رہا کب اُتنا ہوکر رواں زمیں پر

پھر بھی اُٹھالی سر پر تم نے زمیں سب آکر
کیا کیا ہوا تھا تم سے کچھ آگے یاں زمیں پر

کچھ بھی مناسبت ہے یاں عجز واں تکبر
وے آسمان پر ہیں ہیں ناتواں زمیں پر

پست و بلندیاں کا ہے اور ہی طرف سے
اپنی نظر نہیں ہے کچھ آسماں زمیں پر

قصرِ جناں تو ہم نے دیکھا نہیں جو کہیے
شاید نہ ہووے دل سا کوئی مکاں زمیں پر
یاں خاک سے اُنھوں کی لوگوں نے گھر بنائے
آثار ہیں جنھوں کے اب تک یہاں زمیں پر
کیا سر جھکا رہے ہو میرؔ اس غزل کو سُن کر
بارے نظر کرو ٹک اے مہرباں زمیں پر

کیا کیا نہ ہم نے کھینچے آزار تیری خاطر
اب ہو گئے ہیں آخر بیمار تیری خاطر

غزل قطعہ بند

اے صبا گر شہر کے لوگوں میں ہو تیرا گزار
کہیو ہم صحرا نوردوں کا تمامی حالِ زار
خاکِ دہلی سے جُدا ہم کو کیا یکبارگی
آسماں کو تھی کدورت سو نکالا یوں غبار
منصبِ بلبل غزل خوانی تھا سو تو ہے اسیر
شاعری زاغ و زغن کا کیوں نہ ہووے اب شعار

طائرِ خوش زمزمہ کُنجِ قفس میں ہے خموش
چہچہے چڑیاں کرے ہیں صحنِ گلشن میں ہزار

برگِ گل سے بھی کیا نہ ایک نے ٹک ہم کو یاد
نامہ و پیغام و پرسش بے مراتب درکنار

بے خلش کیونکر نہ ہوں گرمِ سخن گلزار میں
ہم قفس میں ہوں کہ میرا تھا دلوں میں خار خار

بلبلِ خوش لہجہ کے جانے پہ گو غوغائیاں
طرح غوغا کی چمن میں ڈالیں پر کیا اعتبار

طائرانِ خوش لب و لہجہ نہیں رہتے چھپے
شور سے اُن کے بھرے ہیں قریہ و شہر و دیار

شہر کے کیا ایک دو کوچوں ہی میں شہرت رہی
شہروں شہروں ملکوں ملکوں ہے اُنھوں کا اشتہار

کیا کہوں سوے چمن ہوتا جو میں سرگرمِ گشت
پھول گل جب کھلنے لگتے جوش زن ہوتی بہار

شور سُن سُن کر غزل خوانی کا میری ہمصفیر
غنچہ ہو آتے جو ہوتا آب و رنگِ شاخسار

خوشنوائی کا جنھیں دعویٰ تھا رہ جاتے خموش

جن کو مَیں کرتا مخاطب اُن کو ہوتا افتخار
بعضوں کو رشکِ قبولِ خاطر و لطفِ سخن
بعضوں کا سینہ فگار و بعضوں کا دل داغدار
ایک کے ہونٹوں کے اوپر "آفریں اُستاد" تھا
ایک کہتا تھا رسوخِ دل ہے اپنا اُستوار
رَبط کا دعویٰ تھا جن کو کہتے تھے مخلص ہیں ہم
جانتے ہیں ذاتِ سامی ہی کو ہم سب خاکسار
نقل کریے کیا یہ صحبت منعقد جب ہوتی بزم
بیٹھ کر کہتے تھے مُنہ پر میرے بعضے بعضے یار
بندگی ہے خدمتِ عالی میں ہم کو دیر سے
گر رکھی ہے جان اپنی ہم نے حضرت پر نثار
سو نہ خط اُن کا نہ کوئی پرچہ پہنچا مجھ تلک
واہ واہ یہ رابطہ رحمت ہے یہ اخلاص و پیار
رفتہ رفتہ ہو گئیں آنکھیں مری دونوں سفید
بسکہ نامے کا کیا یاروں کے مَیں نے انتظار
لکھتے گر دو حرفِ لطف آمیز بعد از چند روز
تو بھی ہوتا اس دلِ بے تاب و طاقت کو قرار

سو تو یک نانوشتہ کاغذ بھی نہ آیا میرے پاس
اُن ہم آوازوں سے جن کا میں کیا ربط آشکار
خط کتابت سے یہ کہتے تھے نہ بھولیں گے تجھے
آویں گے گھر بار کی تیرے خبر کو بار بار
جب گیا مَیں یاد سے تب کس کا گھر کاہے کا پاس
آفریں صد آفریں اے مردمانِ روزگار
اب بیاباں در بیاباں ہے مرا شورِ فغاں
کو چمن میں خوش کی تم نے میری جاے نالہ زار
ہے مثل مشہور یہ عمرِ سفر کوتاہ ہے
طالعِ برگشتہ بھی اب کرتے ہیں امدادِ کار
اک پَرافشانی میں پھر ہے یہ وطن گلزار سا
سامعوں کی چھاتیاں نالوں سے ہو ویں گی فگار
مُنہ پر آویں گے سخن آلودۂ خونِ جگر
کیونکہ یارانِ زماں سے چاک ہے دل جوں انار
دل سے لے کرتا دہن ہیں خونچکاں شکوے بھرے
لیک ہے اظہارِ ہر ناکس سے اپنا ننگ و عار
چُپ بھلی گو تلخکامی کھینچنی اس میں پڑے

بیت بحثی طبعِ نازک پر ہے اپنی ناگوار
آج سے کچھ بے حسابی جور کُن مردم نہیں
اُن سے اہلِ دل سدا کھنچے ہیں رنجِ بے شمار
بس قلم رکھ ہاتھ سے جانے بھی دے یہ حرف میرؔ
کاہ کے جا ہے نہیں کُہسار ہوتے بے وقار
کام کے جو لوگ صاحب فن ہیں سو محسود ہیں
بے تہی کرتے رہیں گے حاسدانِ نابکار

آغشتہ خونِ دل سے سخن تھے زبان پر
رکھے نہ تم نے کان ٹک اس داستان پر
کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز
آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر
دیکھا نہ ہم نے جھوٹ میں یاقوت کی کبھو
تھا جو سماں لبوں کے ترے رنگِ پان پر
کیا رہروانِ راہِ محبت ہیں طُرفہ لوگ
اغماز کرتے جاتے ہیں جی کے زیان پر
موزوں کرو کچھ اور بھی شاید کہ میرؔ جی

رہ جائے کوئی بات کسو کی زبان پر

کس پر تجھے ہے دماغ کہ ابرو بہت ہے خم
کچھ زور سا پڑا ہے کہیں اس کمان پر
کیفیتیں ہزار ہیں اُس کامِ جاں کے بیچ
دیتے ہیں لوگ جان تو ایک ایک آن پر
دامن میں آج میرؔ کے داغِ شراب ہے
تھا اعتماد ہم کو بہت اس جوان پر

مت آنکھ ہمیں دیکھ کے یوں مار دیا کر
غمزے ہیں بلا ان کو نہ سنکار دیا کر
آئینے کی مشہور پریشاں نظری ہے
تو سادہ ہے ایسوں کو نہ دیدار دیا کر
کیوں آنکھوں میں تو سُرمے کا دُنبالہ رکھے ہے
مت ہاتھ میں ان مستوں کے تلوار دیا کر
کچھ خوب نہیں اتنا ستانا بھی کسو کا
ہے میرؔ فقیر اُس کو نہ آزار دیا کر

طاقت نہیں ہے جان میں کڑھنا تعب ہے اَور
بے لطفیاں کرو ہو یہ بس پر غضب ہے اَور
کیا بات تیری اے ہمہ عیّاری و فریب
آنکھیں کہیں ہیں اَور سخن زیرِ لب ہے اَور
اسباب مرگ کے تو مہیّا ہیں سارے میرؔ
شاید کہ زندگانی کا اپنی سبب ہے اور

آ ہمنشیں کسو کے مت عشق کی ہوس کر
جاتی ہیں یوں ہی ناداں جائیں ترس ترس کر
اس قافلے میں کوئی دل آشنا نہیں ہے
ٹکڑے گلے کے اپنے ناحق نہ اے جرس کر

تدبیر دوستوں کی مجھے نفع کیا کرے
بیماری اور کچھ ہے کرے ہیں دوا کچھ اَور
مستانِ عشق و اہلِ خرابات میں ہے فرق
میخوارگی کچھ اور ہے یہ ہے نشا کچھ اَور
صورت پرست ہوتے نہیں معنی آشنا

ہے عشق سے بتوں کے مرا مدعا کچھ اور
مرنے پہ جان دیتے ہیں وارفتگانِ عشق
ہے تیر راہ و رسمِ دیارِ وفا کچھ اور

نئے طور سیکھے نکالے ڈھب اور
مگر اور تھے تب ہوئے ہو اب اور
ادا کچھ ہے، انداز کچھ، ناز کچھ
تہِ دل ہے کچھ اور، زیرِ لب اور
نہ گرمی، نہ جوشش، نہ اب وہ تپاک
تکلف نہیں اس میں تھے تم تب اور

گم سامنے ہوا کہ نہ ایماں نہ دین و دل
کافر کو بھی نہ اس سے الٰہی دوچار کر
جا شوق پر، نہ جا تنِ زار و نزار پر
اے ترکِ صید پیشہ ہمیں بھی شکار کر
مرتے ہیں تیر سب، پہ نہ اس بیکسی کے ساتھ
ماتم میں تیرے کوئی نہ رویا پکار کر

جنوں میں اب کی کام آئی نہ کچھ تدبیر بھی آخر
ہی کل ٹوٹ میرے پاؤں کی زنجیر بھی آخر
اگر ساکت ہیں ہم حیرت سے پر ہیں دیکھنے قابل
کہ اک عالم رکھے ہے عالمِ تصویر بھی آخر
نہ دیکھی ایک واشد اپنے دل کی اس گلستاں میں
کھلے پائے ہزاروں غنچۂ دلگیر بھی آخر
سرو کار آہ کب تک خامہ و کاغذ سے یوں کھیے
رکھے ہے انتہا احوال کی تحریر بھی آخر
پھرے ہے باؤلا سا پیچھے ان شہری غزالوں کے
بیاباں مرگ ہو گا اس چلن سے میرؔ بھی آخر

اُس گوہرِ مراد کو پایا نہ ہم نے میرؔ
پایانِ کار مر گئے یوں خاک چھان کر

مجکو قفس میں سنبل و ریحاں کی کیا خبر
کہہ اے نسیمِ صبح، گلستاں کی کیا خبر
رہتا ہے ایک نشہ اُنھیں جن کو ہے شناخت

ہے زاہدوں کو مستیٔ عرفاں کی کیا خبر

تھی جب تلک جوانی رنج و تعب اُٹھائے
اب کیا ہے میرؔ جی میں ترکِ ستمگری کر

ردیف:- ز

اُس شوخ نے سُنا نہیں نامِ صبا ہنوز
غنچہ ہے وہ لگی نہیں اُس کو ہَوا ہنوز

مُدّت سے ترکِ عشق کیا میرؔ نے، دلے
زار و زبون و زرد ہے بیمار سا ہنوز

ردیف:- س

قیامت ہے کہ اے سرمایۂ جاں نہ ہووے وقت مرنے کے بھی تو پاس

دردمندوں سے تمھیں دُور پھرا کرتے ہو
پوچھنے ورنہ سبھی آتے ہیں بیمار کے پاس
داغ ہوتا نظر آتا ہے دلوں کا آخر
وہ جو اک خال پڑا ہے ترے رُخسار کے پاس

آلودہ کر نہ ہستی سے جامے کو جسم کے
ہُشیار رہ یہ عاریتی ہے لباس پاس

ردیف :- ش

گل کو ہوتا صبا قرار اے کاش
رہتی ایک آدھ دن بہار اے کاش

جان آخر تو جانے والی تھی
اس پہ کی ہوتی میں نثار اے کاش

اس میں راہِ سخن نکلتی تھی
شعر ہوتا ترا شعار اے کاش

شش جہت اب تو تنگ ہے ہم پر
اس سے ہوتے نہ ہم دوچار اے کاش

بے اجل میرؔ اب پڑا مرنا
عشق کرتے نہ اختیار اے کاش

کیا کہیے کیا رکھے ہیں ہم تجھ سے یار خواہش
یک جان و صد تمنا، یک دل ہزار خواہش

اٹھتی ہے موج ہر اک آغوش ہی کی صورت

دریا کو ہے یہ کس کا بوس و کنار خواہش
صد رنگ جلوہ گر ہے ہر جادہ غیرتِ گُل
عاشق کی ایک پاوے کیونکر قرار خواہش

لعلِ خموش اپنے دیکھو ہو آرسی میں
پھر پوچھتے ہو ہنس کر مجھ بے نوا کی خواہش

ردیف :- ط

عشق کی رہ نہ چل خبر ہے شرط
اولِ گام ترکِ سر ہے شرط
دعوے عشق یوں نہیں صادق
زردیٔ رنگ و چشمِ تر ہے شرط
خامی جاتی ہے کوئی گھر بیٹھے
پختہ کاری کے تئیں سفر ہے شرط
دل کا دینا ہے سہل کیا اے میرؔ
عاشقی کرنے کو جگر ہے شرط

کس طور اتفاق پڑے صحبت اُس سے دیر
ہے میرؔ بے دماغ و قیامت کم اختلاط

ردیف :- ع

اُس کے ہوتے بزم میں، فانوس میں آتی ہے شمع
یعنی اُس آتش کے پرکالے سے شرماتی ہے شمع

ردیف:۔ غ

دل کی گرہ میں غنچۂ لالہ کے رنگ میرؔ
سوزِ دروں سے کچھ نہیں ہے اب سوائے داغ

ردیف:- ف

میلانِ دل ہے زُلفِ سیہ فام کی طرف
جاتا ہے صید آپ سے اس دام کی طرف

ردیف :- ق

اے رشکِ برق تجھ سے مشکل ہے کارِ عاشق
اک جھمکی میں کہاں پھر صبر و قرارِ عاشق

خاکِ سیہ سے یکساں تیرے لیے ہوا ہے
تو بھی تو ایک شب ہو شمعِ مزارِ عاشق

دل خواہ کوئی دلبر ملتا تو دل کو دیتے
گر چاہنے میں ہوتا کچھ اختیارِ عاشق

کیا جانے محو جو ہو اپنے ہی رُو و مُو کا
گزرے ہے کس طرح سے لیل و نہارِ عاشق

خواری کا اپنی موجب ہے اضطراب ہر دم
دل سمجھے تو رہے بھی کچھ اعتبارِ عاشق

اس پردے میں غمِ دل کہتا ہے میرؔ اپنا
کیا شعر و شاعری ہے یارو شعارِ عاشق

کیا کہوں تم سے میں کہ کیا ہے عشق
جان کا روگ ہے، بلا ہے عشق
عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو
سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق
عشق معشوق، عشق عاشق ہے
یعنی اپنا ہی مبتلا ہے عشق
عشق ہے طرز و طور عشق کے تئیں
کہیں بندہ کہیں خدا ہے عشق
دل کش ایسا کہاں ہے دشمنِ جاں
مدعی ہے، پہ مدعا ہے عشق
ہے ہمارے بھی طور کا عاشق
جس کسو کو کہیں ہوا ہے عشق
کوئی خواہاں نہیں محبت کا
تو کہے جنسِ ناروا ہے عشق
میرؔ جی زرد ہوتے جاتے ہو
کیا کہیں تم نے بھی کیا ہے عشق

ردیف:- ک

برسوں ہوئے کہ جان سے جاتی نہیں خلش
ٹک ہل گئی تھی آگے مرے وہ بھری پلک

عزت اپنی اب نہیں ہے یار کو منظور ٹک
پاس جاتا ہوں تو کہتا ہے کہ بیٹھو دُور ٹک

جو آرزو کی اُس سے سو دل میں ہی خوں ہوئی
نومید یوں بسر کرے کوئی کہاں تلک
بلبل قفس میں اس لب و لہجہ پہ یہ فغاں
آواز ایک ہو رہی ہے گلستاں تلک

دل تنگ ہو جیے تو نہ ملیے کسو کے ساتھ
ہوتے ہیں ایسے وقت میں یہ لوگ کم شریک

ہم گرے اُس کے در ہی پر مر کر
اَور کوئی کرے وفا کیا خاک
خاک ہی میں ملائے رکھتے ہو
ہو کوئی تم سے آشنا کیا خاک
سب موے ابتدائے عشق ہی میں
ہووے معلوم انتہا کیا خاک
تربتِ میر پہ چلے تم دیر
اتنی مُدّت میں واں رہا کیا خاک

بے گدازِ دل نہیں امکان رونا اس قدر
تہ کو پہنچو خوب تو پردا ہے چشمِ گریہ ناک

سو خونچکاں گلے ہیں دل سے مری زباں تک
جی رُندھ گیا ہے ظالم اب رحم کر، کہاں تک
ہونا جہاں کا اپنی آنکھوں میں ہے نہ ہونا
آتا نظر نہیں کچھ جاوے نظر جہاں تک

مجھے نیند کیسی کہ مانندِ انجم
کھُلی رہتی ہیں میری آنکھیں سحر تک
دماغ اور دل ہیں سراسیمہ دونوں
سرِ زخم شاید کہ پہُنچا جگر تک

ردیف: گ

غافل ہیں ایسے سوتے ہیں گویا جہاں کے لوگ
حالانکہ رفتنی ہیں سبب اس کارواں کے لوگ

مرتے ہیں اُس کے واسطے یوں تو بہت' وے
کم آشنا ہیں طور سے اُس کام جاں کے لوگ

پتے کو اس چمن کے نہیں دیکھتے ہیں گرم
جو محرمِ روش ہیں کچھ اُس بدگماں کے لوگ

فردوس کو بھی آنکھ اُٹھا دیکھتے نہیں
کس درجہ سیر چشم ہیں کوے بتاں کے لوگ

کیا سہل جی سے ہاتھ اُٹھا بیٹھتے ہیں' ہاے
یہ عشق پیشگاں ہیں الٰہی کہاں کے لوگ

مُنہ تکتے ہی رہے ہیں سدا مجلسوں کے بیچ
گویا کہ میرؔ محو ہیں میری زباں کے لوگ

افسردگیٔ سوختہ جاناں ہے قہر' میرؔ

دامن کو ٹک ہلا کہ جگر کی بجھی ہے آگ

ہے آگ کا سا نالۂ کاہش فزا کا رنگ
کچھ اور صبح دم سے ہوا ہے ہوا کا رنگ
دیکھے ادھر تو مجھ سے نہ یوں آنکھ وہ چھپا مے
ظاہر ہے میرے مُنہ سے مرے مدعا کا رنگ
کس بے گنہ کے خوں میں ترا پڑ گیا ہے پاؤں
ہوتا نہیں ہے سُرخ تو ایسا حنا کا رنگ
بے گہ شکستہ رنگیٔ خورشید کیا عجب
ہوتا ہے زرد بیشتر اہلِ فنا کا رنگ
گل پیرہن نہ چاک کریں کیونکے رشک سے
کس مرتبے میں شوخ ہے اُس کی قبا کا رنگ
پوچھے ہیں وجہ گریۂ خونیں جو مجھ سے لوگ
کیا دیکھتے نہیں ہیں سب اُس بے وفا کا رنگ
مقدور تک نہ گزرے مرے خوں سے یار میر
غیروں سے کیا گلہ ہے یہ ہے آشنا کا رنگ

رہِ مرگ سے کیوں ڈراتے ہیں لوگ
بہت اُس طرف کو تو جاتے ہیں لوگ

مظاہر سب اُس کے ہیں ظاہر ہے وہ
تکلف ہے یاں جو چھُپاتے ہیں لوگ

رہے ہم تو کھوئے گئے سے سدا
کبھو آپ میں ہم کو پاتے ہیں لوگ

اُن آنکھوں کے بیمار ہیں میر ہم
بجا دیکھنے ہم کو آتے ہیں لوگ

ردیف:- ل

مار بھی آسان ہے، دُشنام سہل
یار اگر ہے اہل تو ہے کام سہل

ہے تیرہ یہ بیاباں گرد و غبار سے سب
دے راہ کب دکھائی بے رہنمائیے دل
اندوہ و غم سے اکثر رہتا ہوں میں مکدّر
کیا خاک میں ملی ہے میری صفائیے دل

مُدّت تو وا ہوا ہی نہیں غنچہ وار دل
اب جو کھلا تو جیسے گُلِ بے بہار دل
وہ کون سی اُمید بر آئی ہے عشق میں
رہتا ہے کس اُمید پہ اُمّید وار دل
داخل یہ اضطراب تنگ آ بیوں میں ہے
رکھتی نہیں ہے برق ہی کچھ بے قرار دل

ہم سے جو عشق کُشتہ جئیں تو عجب ہے میرؔ
چھاتی ہے داغ، ٹکڑے جگر کے، فگار دل

لیا زاہد نے جامِ بادہ برکف
بحمد اللہ کھلا عقدِ انامل

وہی پہنچے تو پہنچے آپ ہم تک
نہ یاں طالع رسا نے جذب کامل

ہوا دل عشق کی سختی سے ویراں
ملائم چاہیے تھا یاں کا عامل

ردیف :- م

کچھ نہ پوچھو بہک رہے ہیں ہم
عشق کی مَے سے چھک رہے ہیں ہم
وقفۂ مرگ اب ضروری ہے
راہ طَیْ کرتے تھک رہے ہیں ہم
کون پہنچے ہے بات کی تہ کو
ایک مُدت سے بک رہے ہیں ہم

ہے ترِ دل بتوں کا کیا معلوم نکلے پردے سے کیا خدا معلوم
یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم
گرچہ تو ہی ہے سب جگہ لیکن ہم کو تیری نہیں ہے جا معلوم
ان سیہ چشم دلبروں سے ہمیں تھی وفا چشم، سو وفا معلوم

مجھے تو درد سے اک اُنس ہے وفا کی قسم
یہی سبب ہے جو کھاتی ہے یں دوا کی قسم

فقیر ہونے نے سب اعتبار کھو یا ہے
قسم جو کھاؤں تو کہتے ہیں کیا گدا کی قسم

مطلق نہیں گنجائش اب حوصلے میں اپنے
آزار کوئی کھینچے یوں کب تئیں، بس ظالم
سررشتۂ ہستی کو ہم دے چکے ہاتھوں سے
کچھ ٹوٹے ہی جاتے ہیں اب تارِ نفس ظالم

تربت سے ہماری نہ اُٹھی گرد بھی اے میر
جی سے گئے لیکن نہ کیا ترکِ ادب ہم

اب چھیڑیے جہاں وہیں گویا ہے دردِ سب
پھوڑا سا ہو گیا ہے ترے غم میں تن تمام
اک گل زمیں نہ وقفے کے قابل نظر پڑی
دیکھا برنگِ آبِ رواں یہ چمن تمام

بختِ سیہ کی نقل کریں کس سے چال ہم

مہندی لگی قدم سے ہوے پائمال ہم

کون کہتا ہے منہ کو کھولو تم
کاشکے پردے ہی میں بولو تم
رات گزری ہے سب تڑپتے میرؔ
آنکھ لگ جائے ٹک تو سولو تم

موے جاتے تھے فرطِ اُلفت سے ہم
جیے ہیں خدا ہی کی قدرت سے ہم
جو دیکھو وہ قامت تو معلوم ہو
کہ رُوکش ہوئے ہیں قیامت سے ہم
نہ مانی کوئی بات پھر رُوٹھ کر
مناتے رہے رات منت سے ہم
خدا سے بھی شب کو دعا مانگتے
نہ اُس کا لیا نام غیرت سے ہم

یہ شوق صید ہونے کا دیکھو کہ آپ کو
دکھلا یا صید گہ میں یسار و یمیں سے ہم

ردیف:- ن

مدعی مجکو کھڑے صاف بُرا کہتے ہیں
چُپکے تم سُنتے ہو بیٹھے اسے کیا کہتے ہیں
دیکھے خوباں کے بجا دل نہیں رہتا ہرگز
لوگ جو کچھ انھیں کہتے ہیں بجا کہتے ہیں
حُسن تو ہے ہی کرو لطفِ زباں بھی پیدا
میرؔ کو دیکھو کہ سب لوگ بھلا کہتے ہیں

اپنا ہی ہاتھ سر پہ رہا اپنے یاں سدا
مشفق کوئی نہیں ہے کوئی مہرباں نہیں
ہے عشق ہی سے چار طرف بحث گو گفتگو
شور اس بلائے جاں کا جہاں میں کہاں نہیں
اس عہد کو نہ جانیے اگلا سا عہد میرؔ
وہ دَور اب نہیں وہ زمیں آسماں نہیں

نہ نکلا دوسرا ویسا جہاں میں ۔ وہی اک جنس ہے اس کارواں میں
کیا مُنہ بند سب کا بات کہتے ۔ ملا کچھ سحر ہے اُس کی زباں میں
نیا آناً فاناً اُس کو دیکھا ۔ جُدا اک تھی شان اُس کی ہر آں میں
کوئی بجلی کا ٹکڑا اب تلک بھی ۔ پڑا ہوگا ہمارے آشیاں میں

نہیں تبخالِ لعلِ دلربا میں ۔ گہر پہنچا ہم آبِ بقا میں
غریبانہ کوئی شب، روز کرہاں ۔ ہمیشہ کون رہتا ہے سرا میں
اُٹھاتے ہاتھ کیوں نومید ہو کر ۔ اگر پاتے اثر کچھ ہم دعا میں
کہے ہے ہر کوئی اللہ میرا ۔ عجب نسبت ہے بندے و خدا میں
بلا تہ دار بحرِ عشق نکلا ۔ کہ ہم نے انتہا کی ابتدا میں
ملے برسوں وہی بیگانہ ہے وہ ۔ ہنر ہے یہ ہمارے آشنا میں
اگرچہ خُشک ہیں جیسے پرِ کاہ ۔ اُڑے ہیں میرؔ جی لیکن ہوا میں

یوسف عزیزِ دلہا جا مصر میں ہوا تھا
پاکیزہ گوہروں کی عزّت نہیں وطن میں

کن نے لمبے بال دکھلائے ترے مانی کے تئیں

اُن نے جو اس طول سے کھینچی پریشانی کے تئیں
کُشتۂ انداز کس کا تھا نہ جانا وہ جواں
لے رہے تھے کچھ ملک اک نعش قربانی کے تئیں
طائرانِ خوش معاش اس باغ کے ہم تھے کبھو
اب ترستے ہیں قفس میں اک پرافشانی کے تئیں
دل جو پانی ہو تو آئینہ ہے رُوے یار کا
خانہ آبادی سمجھ اس خانہ ویرانی کے تئیں
کچھ نظر مَیں نے نہ کی جی کے زیاں پر اپنے ہائے
دوست ہی رکھے گیا اُس دُشمنِ جانی کے تئیں
جب جَلے چھاتی بہت تب اشک افشاں ہو نہ میر
کیا جو چھیڑ کا اس دَہکتی آگ پر پانی کے تئیں

جانا ادھر سے میرا ہے ویسا اُدھر کے تئیں
بیماریوں میں جیسے بدلتے ہیں گھر کے تئیں
زخمی کو اُس نگہ کے طبیبوں سے کام کیا
ہمدم مجھے دکھا کسو صاحب نظر کے تئیں
تم دل سے جو گئے تو خرابی بہت رہی

پھر بھی کبھو آ کر اس اُجڑے نگر کے تئیں
حالت یہ ہے کہ بے خبری دمبدم ہے یاں
وے اب تلک بھی آتے نہیں ٹک خبر کے تئیں
مدّت ہوئی کہ اپنی خبر کچھ نہیں ہمیں
کیا جانیے کہ میرؔ گئے ہم کدھر کے تئیں

کیا کہوں اوّل بخود تو دیر میں آتا ہوں میں
پھر جو یاد آتا ہے وہ چُپکا سا رہ جاتا ہوں میں
آب سب ہوتا ہوں پا کر آپ کو جیسے حباب
یعنی اس ننگِ عدم ہستی سے شرماتا ہوں میں
ایک جاگہ کب ٹھہرنے دے ہے مجکو روزگار
کیوں تم اُکتاتے ہو اتنا، آجکل جاتا ہوں میں
ہے کمالِ عشق پر بے طاقتی دل کی دلیل
جلوۂ دیدار کی اب تاب کب لاتا ہوں میں
آسماں معلوم ہوتا ہے وَرے کچھ آ گیا
دور اُس سے آہ کیسا کیسا گھبراتا ہوں میں
بس چلے تو راہ اُدھر کی میں نہ جاؤں لیک میرؔ

دل مرا رہتا نہیں ہر چند سمجھاتا ہوں میں

ایامِ ہجر کریے بسر کس اُمید پر
ملنا اُنھوں کا صبح نہیں، شام بھی نہیں
کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں، ایہام بھی نہیں

گرچہ عالم جلوہ گاہِ یار یوں بھی تھا، ولے
آنکھیں جب موندیں عجب عالم نظر آیا ہمیں
تجھ تک اس بے طاقتی میں کیا پہنچنا سہل تھا
غَش ترے کوچے میں ہر ہر گام پر آیا ہمیں
کر چلا بے خود غمِ زُلفِ درازِ دلبراں
دُور کا اے میر در پیش اب سفر آیا ہمیں

اشک کے جوش سے ہوں شام وسحر پانی میں
جیسے ماہی ہے مجھے سیر وسفر پانی میں
شب نہاتا تھا جو وہ رشکِ قمر پانی میں

گُھتی ماہتاب سے اُٹھتی تھی لہر پانی میں
ساتھ اس حُسن کے دیتا تھا دکھائی وہ بدن
جیسے جھمکے ہے پڑا گوہرِ تر پانی میں
آتشِ عشق نے راون کو جلا کر مارا
گرچہ لنکا سا تھا اس دیو کا گھر پانی میں
چشمِ تر ہی میں رہے کاش وہ روئے خوش رنگ
پُھول رہتا ہے بہت تازہ و تر پانی میں
محو کر آپ کو یوں ہستی میں اُس کی جیسے
بُوند پانی کی نہیں آتی نظر پانی میں

ہیئت آنکھوں کی نہیں وہ رہی روتے روتے
اب تو گرداب سے آتے ہیں نظر پانی میں
طبعِ دریا جو ہو آشفتہ تو پھر طوفاں ہے
آہ بالوں کو پراگندہ نہ کر پانی میں
فرطِ گریہ سے ہوا میرؔ تباہ اپنا جہاز
تختہ پارے گئے کیا جانوں کدھر پانی میں

رکھا کر اشک افشاں چشم فرصت غیر فرصت میں
کہ مِل جاتا ہے اِن جوڑوں کا پانی بحرِ رحمت میں
تحمل ہو سکا جب تک بدن میں تاب و طاقت تھی
قیامت اب گزر جاتی ہے دل پر ایک ساعت میں
عجب کیا ہے جو یارانِ چمن ہم کو نہ پہچانیں
رہائی اتفاق اپنی پڑی ہے ایک مُدّت میں
قدم پر رکھ قدم اُس کے بہت مشکل ہے مر جانا
سرآمد ہو گیا ہے میرؔ فنِّ مہر و اُلفت میں

کس کنے جاؤں الٰہی کیا دوا پیدا کروں
دل تو کچھ بیٹھا ہی جاتا ہے کروں سو کیا کروں
مصلحت ہے میری خاموشی ہی میں اے ہمنفس
لو ہو ٹپکے بات سے جو ہونٹ اپنے وا کروں
دل پریشانی مجھے دیتا ہے بکھرے گُل کے رنگ
آپ کو جوں غنچہ کیونکر آہ میں یکجا کروں
خوار تو آخر کیا ہے گلیوں میں تو نے مجھے
تو سہی اے عشق جو تجھکو بھی میں رُسوا کروں

کیا کوفتیں اُٹھائیں ہجراں کے درد و غم میں
تڑپا ہزار نوبت دل ایک ایک دَم میں
کُلفت میں گزری ساری مُدّت تو زندگی کی
آسودگی کا مُنہ اب دیکھیں گے ہم عدم میں

عشق میں جی کو صبر و تاب کہاں　　اُس سے آنکھیں لگیں تو خواب کہاں
ہستی اپنی ہے بیچ میں پردہ　　ہم نہ ہوویں تو پھر حجاب کہاں
گریۂ شب سے سُرخ ہیں آنکھیں　　مجھ بلا نوش کو شراب کہاں
عشق کا گھر ہے میرؔ سے آباد　　ایسے پھر خانماں خراب کہاں

ق

یارو مجھے معاف رکھو میں نشے میں ہوں
اب دو تو جام خالی ہی دو میں نشے میں ہوں
مستی سے درہمی ہے مری گفتگو کے بیچ
جو چاہو تم بھی مجھکو کہو، میں نشے میں ہوں
یا ہاتھوں ہاتھ لو مجھے مانندِ جامِ مے
یا تھوڑی دُور ساتھ چلو، میں نشے میں ہوں

کاشکے دل دو تو ہوتے عشق میں
ایک رہتا ایک کھوتے عشق میں
خواب میں دیکھا تھا اُس کو ایک رات
برسوں کاٹے ہم نے سوتے عشق میں

کرتے ہیں جو کہ جی میں ٹھانے ہیں
خوب رُو کس کی بات مانے ہیں
میں تو خوباں کو جانتا ہی ہوں
پر مجھے یہ بھی خوب جانے ہیں
اب تو افسردگی ہی ہے ہر آن
وے نہ ہم ہیں نہ وے زمانے ہیں
قیس و فرہاد کے وہ عشق کے شور
اب مرے عہد میں فسانے ہیں
عشق کرتے ہیں اُس پری رُو سے
میر صاحب بھی کیا دوانے ہیں

باغِ فردوس کا ہے رشک وہ کوچہ، لیکن
آدمی ایک نہیں اُس کے ہواداروں میں
اضطراب و قلق و ضعف ہیں گر میر یہی
زندگی ہو چکی تو اپنی ان آزاروں میں

کوئی ہم سا بھی اپنی جان کا دشمن کہیں ہوگا

بھری مجلس میں بیٹھے عشق کا اقرار کرتے ہیں
حجابِ ناکسی سے مر گئے رو پوش کب تک ہیں
جنھوں سے عار تھی ہم کو سو ہم سے عار کرتے ہیں
الف کی رمز اگر سمجھا اُٹھا دل بحثِ علمی سے
اسی اک حرف کو برسوں سے ہم تکرار کرتے ہیں
بلا آفت ہے کچھ دل پر کہ ایسا رنگ ہے اُن کا
کسو بے مہر کے تئیں میرؔ شاید پیار کرتے ہیں

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں
کہیئے لطافت اُس تنِ نازک کی میرؔ کیا
شاید یہ لطف ہو گا کسو جانِ پاک میں

آج ہمارے گھر آیا تو، کیا ہے یہاں جو نثار کریں
الا کھینچ بغل میں تجکو دیر تلک ہم پیار کریں
خاک ہوئے، پامال ہوئے، برباد ہوئے سب محو ہوئے
اور شدائد عشق کی رہ کے کیسے ہم ہموار کریں

شیوہ اپنا بے پروائی نومیدی سے ٹھہرا ہے
کچھ بھی وہ مغرور دبے تو منّت سو سو بار کریں
پتّا پتّا گلشن کا تو حال ہمارا جانے ہے
اَور کہے تو جس سے اے گُل بے برگی اظہار کریں

گل کو کیا نسبت ہے تجھ سے میں نہ مانوں زینہار
رنگ اگر بالفرض تیرا سا ہوا، یہ بو کہاں
میر سچ کہتا تھا، جنّت ہو نصیب اُس کے تئیں
حُور کا چہرہ کہاں، اُس کا رُخِ نیکو کہاں

بے گانہ وضع برسوں اس شہر میں رہا ہوں
بھاگوں ہوں دور سب سے میں کس کا آشنا ہوں
پوچھا ہی گی ہے مجھ سے گُل برگِ لب کو تیرے
بلبل کے ہاتھ جب میں گلزار میں لگا ہوں
اب کارِ شوق دیکھوں پہنچے مرا کہاں تک
قاصد کے پیچھے مَیں بھی بے طاقت اُٹھ چلا ہوں
کیا کیا تامّل اس فکر میں گیا گھُل

سمجھا نہ آپ کو میں کیا جانیے کہ کیا ہوں

کوچے میں تیرے میرؔ کا مطلق اثر نہیں
کیا جانیے کدھر کو گیا کچھ خبر نہیں
ہے عاشقی کے بیچ ستم دیکھنا ہی لطف
مر جانا آنکھ موند کے یہ کچھ ہنر نہیں
کب شب ہوئی زمانے میں جو پھر ہوا نہ روز
کیا اے شبِ فراق تجھی کو سحر نہیں
ہر چند ہم کو مستوں سے صحبت رہی ہے لیک
دامن ہمارا ابر کے مانند تر نہیں
گلگشت اپنے طور پہ ہے خوب، شو تو یاں
شائستۂ پریدنِ گلزار پر نہیں

کھنچتا چلا ہے اب تو تصدیق کو تصور
ہر لحظہ اُس کے جلوے پیشِ نظر رہے ہیں
کل دیکھتے ہمارے بستے تھے گھر برابر
اب یہ کہیں کہیں جو دیوار و در رہے ہیں

نے غم ہے کچھ یہاں کا نے فکر کچھ وہاں کا
صدقے جنوں کے کیا ہم بے دردِ سر رہے ہیں
اس میکدے میں جس جا ہشیار رہا چاہیے تھے
رحمت رہے ہم کو ہم بھی کیا بے خبر رہے ہیں
چل ہمنشیں بنے تو ایک آدھ بیت سُنیے
کہتے ہیں بعدِ مُدّت میرؔ اپنے گھر رہے ہیں

اے کاش ہم کو سُکر کی حالت رہے مدام
تا حال کی خرابی سے ہم بے خبر رہیں
رہتے ہیں یوں حواس پریشاں کہ جوں نہیں
دو تین آکے لوٹے مسافر اُتر رہیں
فردا کی فکر آج نہیں مقتضائے عقل
کل کی بھی دیکھیو یں گے کل ہم اگر رہیں

حیراں ہو میرے حال میں کہنے لگا طبیب
اس دردمندِ عشق کی میں کیا دوا لکھوں

کیا کہیئے آہ جی کو قیامت ہے انتظار
آتا نہ کاشں وعدۂ دیدار درمیاں

باغ گو سبز ہوا اب سرِ گلزار کہاں
دل کہاں، وقت کہاں، عمر کہاں، یار کہاں
دم زدن مصلحتِ وقت نہیں ہے ہمدم
جی میں کیا کیا ہے مرے پر لبِ اظہار کہاں
ڈوبا لوہو میں پڑا تھا ہمگی پہ شکرِ میرؔ
یہ نہ جانا کہ لگی ظلم کی تلوار کہاں

اے مجھ سے تجکو سَو ملے تجھ سا نہ پایا ایک میں
سو سو کہیں تونے مجھے، مُنہ پر نہ لایا ایک میں
عالم کی مَیں نے سیر کی، تجکو جو خوش آیا سو تو
سب سے رہا محظوظ تو، تجکو نہ بھایا ایک میں
یہ جوشِ غم ہوتے بھی ہیں، یوں ابرِ تر روتے بھی ہیں
چشمِ "جہاں آشوب" سے دریا بہایا ایک میں
تھا سب کو دعوائے عشق کا لیکن نہ ٹھہرا کوئی بھی

دانستہ اپنی جان سے دل کو اُٹھایا ایک میں
ہیں طالبِ صورت سبھی مجھ پر ستم کیوں اس قدر
کیا مجرمِ عشقِ بُتاں یاں ہوں خدایا ایک میں
بجلی سے یوں چمکے بہت پر بات کہتے ہو چکے
جوں ابر ساری خلق پر ہوں اب تو چھایا ایک میں
سو رنگ وہ ظاہر ہوا کوئی نہ جاگہ سے گیا
دل کو جو میرے چوٹ تھی طاقت نہ لایا ایک میں
اس گلستاں سے منفعت یوں تو ہزاروں کو ہوئی
دیکھا نہ سرو و گل کا یاں ٹک سر پہ سایا ایک میں
رسمِ کہن ہے دوستی ہوتی بھی ہے اُلفت بہم
میں کُشتنی ٹھہرا جو ہوں کیا دل لگایا ایک میں
جن جن نے دیکھا تھا اُسے بےخود ہوا جیتا بھی پھر
پر میر جیتے جی بخود ہرگز نہ آیا ایک میں

چمن میں جا کے بھرو تم گلوں سے جیب و کنار
ہم اپنے دل ہی کے ٹکڑوں سے گل بداماں ہیں

جور کیا کیا جفائیں کیا کیا ہیں عاشقی میں بلائیں کیا کیا ہیں
خوب رُو ہی نہیں فقط وہ شوخ حسن کیا کیا ادائیں کیا کیا ہیں
فکرِ تعمیرِ دل کسو کو نہیں ایسی ویسی بنائیں کیا کیا ہیں
گہ نسیم و صبا ہے گاہ سموم اس چمن میں ہوائیں کیا کیا ہیں
شور ہے ترکِ شیخ کا، لیکن چُپکے چُپکے دعائیں کیا کیا ہیں
منظرِ دیدہ، قصرِ دل اے میرؔ شہرِ دل میں بھی جائیں کیا کیا ہیں

فراق آنکھ لگنے کی جا ہی نہیں پلک سے پلک آشنا ہی نہیں
گلہ عشق کا بدوِ خلقت سے ہے غمِ دل کو کچھ انتہا ہی نہیں
وہ کیا کچھ نہیں حُسن کے شہر میں نہیں ہے تو رسمِ وفا ہی نہیں
نہیں دَیر اگر میرؔ کعبہ تو ہے ہمارے کوئی کیا خدا ہی نہیں

سوزِ دروں سے کیونکر میں آگ میں نہ لوٹوں
جوں شیشۂ حبابی سب دل پر آبلے ہیں
اندیشہ زادِ رہ کا رکھیے تو ہے مناسب
چلنے کو یاں سے اکثر طیّار قافلے ہیں

محبت نے کھویا کھپایا ہمیں ۔ بہت اُس نے ڈھونڈا نہ پایا ہمیں
ملے ڈالے ہے دل کوئی عشق میں ۔ یہ کیا روگ یارب لگایا ہمیں
نہ سمجھی گئی دُشمنی عشق کی ۔ بہت دوستوں نے جتایا ہمیں
کوئی دم کل آئے تھے مجلس میں میرؔ ۔ بہت اس غزل پر رُلایا ہمیں

جنوں نے تماشا بنایا ہمیں ۔ رہا دیکھ اپنا پرایا ہمیں
سدا ہم تو کھوئے گئے سے رہے ۔ کبھو آپ میں تم نے پایا ہمیں

کیا عبث مجنوں پئے محمل ہے میاں
یہ دِوانا باؤلا عاقل ہے میاں
ہم نے یہ مانا کہ واعظ ہے ملک
آدمی ہونا بہت مشکل ہے میاں
چشمِ تر کی خیر جاری ہے سدا
سیل اس دروازے کا سائل ہے میاں
مرنے کے پیچھے تو راحت سچ ہے. لیک
بیچ میں یہ واقعہ حائل ہے میاں
چاہیے پیش از فنا آنکھیں کھلیں

حیف اُس کا وقت جو غافل ہے میاں
رنگِ بے رنگی جُدا تو ہے وے
آب سا ہر رنگ میں شامل ہے میاں
بے تہی دریائے ہستی کی نہ پوچھ
یاں سے واں تک سو جگہ ساحل ہے میاں
چشمِ حق بیں سے کرو ٹک تم نظر
دیکھتے جو کچھ ہو سب باطل ہے میاں
دردمندی ہی تو ہے جو کچھ کہ ہے
حق میں عاشق کے دوا قاتل ہے میاں
کیا دلِ مجروح و محزوں کا گلہ
ایک غمگیں دوسرے گھائل ہے میاں
کی زیارت میرؔ کی ہم نے بھی کل
لا اُبالی سا ہے پر کامل ہے میاں

لذت سے درد کی جو کوئی آشنا نہیں
سو لطف کیوں نہ جمع ہوں اُس میں مزا نہیں
رنگ اور بُو تو دل کش و دلچسپ ہیں کمال

لیکن ہزار حیف کہ گُل میں وفا نہیں

تیرِ ستم کا تیرے ہدف کب تلک رہوں
آخر جگر ہے، لوہے کا کوئی توا نہیں

یہیں مسدود ہے کچھ راہِ وفا ورنہ ہم
سب کہیں نامہ و پیغام چلے جاتے ہیں
دیکھیں پیش آوے ہے کیا عشق میں اب تو جوں سَیل
ہم بھی اس راہ میں سرگاڑے چلے جاتے ہیں

گفتگو اتنی پریشاں، حال کی یہ درہمی
میر کچھ دل تنگ ہے، ایسا نہ ہو سودا ہو میاں

معلوم نہیں کیا ہے لبِ سُرخِ بُتاں میں
اس آتشِ خاموش کا ہے شور جہاں میں
دے یاسمنِ تازہ شگفتہ میں کہاں میر
پائے گئے لطف اُس کے جو پاؤں کے نشاں میں

ردیف :- و

اتنا کہا نہ ہم سے تم نے کبھو کہ آؤ
کاہے کو یوں کھڑے ہو وحشی سے بیٹھ جاؤ
یہ چاند کے سے ٹکڑے چھپتے نہیں چھپائے
ہرچند اپنے منہ کو برقع میں تم چھپاؤ

نہ مائل آرسی کا رہ سراپا درد ہوگا تو
نہ ہو گلچینِ باغِ حسن ظالم زرد ہوگا تو
یہ پیشہ عشق کا ہے خاک چھنوائے گا صحرا کی
ہزارا اے بے وفا جوں گل چمن پرورد ہوگا تو
غبار اٹھنے لگے گا تیری اس نازک طبیعت سے
بسانِ گردباد آخر بیاباں گرد ہوگا تو
علاقہ دل کا لکھوائے گا دفتر ہاتھ سے تیرے
تجرد کے جریدوں میں قلم سا فرد ہوگا تو
نہ اک دم صبح تک بھی آنکھ لگنے دے گا دل جلنا

یہی پھر میرؔ سا سرگرمِ آہِ سرد ہو گا تو

کیا اُس کے گئے ہے ذکرِ دل کا ویران پڑا ہے یہ مکاں تو
مت تربتِ میرؔ کو مٹاؤ رہنے دو غریب کا نشاں تو

ملتفت ہوتا نہیں ہے گاہ تو کس قدر مغرور ہے اللہ تو
اُس کے دل میں کام کرنا کام ہے یوں فلک پر کیوں نہ جا اے آہ تو
میرؔ تو تو عاشقی میں کھپ گیا مت کسو کو چندروز اب چاہ تو

ہوں تو نالاں زیرِ دیوارِ چمن پر ضعف سے
گوش زد گل کے نہیں ہوتا مرا شیون کبھو

گلبرگ سے ہے نازک خوبی پا تو دیکھو
کیا ہے جھمک کنک کی رنگِ حنا تو دیکھو
ہر بات پر خشونت طرزِ جفا تو دیکھو
ہر لحظہ بے ادائی اُس کی ادا تو دیکھو
سالف میں ہر پلک کے خوابیدہ ہے قیامت

اُس فتنۂ زماں کو کوئی جگا تو دیکھو
بُلبل بھی گُل گئے پر مر کر چمن سے نکلی
اس مُرغِ شوق کش کی ٹک تم وفا تو دیکھو
طنزیں عبث کرو ہو غش رہنے پر ہمارے
دو چار دن کسو سے دل کو لگا تو دیکھو
ہونا پڑے ہے دُشمن ہر گام اپنی جاں کا
کوچے میں دوستی کے ہر کوئی آ تو دیکھو
ہے اس چمن میں وہ گُل صدرنگ محوِ جلوہ
دیکھو جہاں وہی ہے کچھ اُس سوا تو دیکھو
اشعارِ میرؔ پر ہے اب ہاے واے ہر سو
کچھ سحر تو نہیں ہے لیکن ہوا تو دیکھو

بدزباں ہو جیسے خوش اسلوب ہو — کیا کہیں جو کچھ کہ ہو تم خوب ہو
ایسا شہرِ حُسن ہی ہے "تازہ رسم" — دوستی باہم جہاں معیوب ہو
جو کہو ہو سو مخالف عقل کے — میرؔ صاحب تم مگر مجذوب ہو

منعقد کاش مجلسِ مل ہو — درمیاں تو ہو سامنے گُل ہو

گر میاں متصل رہیں باہم — نے تساہل ہو، نے تغافل ہو
اب دھواں یوں جگر سے اٹھتا ہے — جیسے پرپیچ کوئی کاکل ہو
نہ تو طالع، نہ جذب، پھر دل کو — کس بھروسے پہ ٹک تحمل ہو
دیر رہنے کی جا نہیں یہ چمن — بوئے گل ہو، صفیرِ بلبل ہو

نہ میرے باعثِ شور و فغاں ہو — ابھی کیا جانیے یاں کیا سماں ہو
یہی مشہورِ عالم ہیں دو عالم — خدا جانے ملا پر اُس سے کہاں ہو
جہاں سجدے میں ہم نے غش کیا تھا — وہیں شاید کہ اُس کا آستاں ہو

رہتے ہو تم آنکھوں میں پھرتے ہو تمھیں دل میں
مدت سے اگرچہ یاں آتے ہو نہ جاتے ہو

ہر صبح و شام تم پئے ایذائے میرؔ ہو
ایسا نہ ہو کہ کام ہی اُس کا اخیر ہو
ہو کوئی بادشاہ کوئی یاں وزیر ہو
اپنی بلا سے، بیٹھ رہے جب فقیر ہو
جنت کی منت اُن کے دماغوں سے کب اٹھے

خاکِ رہ اُس کی جن کے کفن کا عبیر ہو
کیا یوں ہی آب و تاب سے ہو بیٹھے کارِ عشق
سوکھے جگر کا خوں تو رواں جوئے شیر ہو
چھاتی قفس میں داغ سے ہو کیوں نہ رشکِ باغ
جوشِ بہار تھا کہ ہم آنے اسیر ہو
اک وقتِ خاص حق میں مرے کچھ دعا کرو
تم بھی تو میر صاحب و قبلہ فقیر ہو

ٹک لطف سے بلا کر گو پھر کبھو کبھو ہو
سو تب تلک کہ مجکو ہجراں سے تیرے خو ہو
کیا کیا جوان ہم نے دُنیا سے جاتے دیکھے
اے عشق بے محابا دُنیا ہو اور تو ہو
پُرخوں ہمارے دل سے کتنی ہے تو مشابہ
شاید کلی تجھے بھی اُس گُل کی آرزو ہو
کھولے تھے بال کن نے ہنگامِ صبح اپنے
آئی ہے اے صبا تو ایسی جو مشکبو ہو
درویشی سے بھی اپنی نکلے ہے میرزائی

نقشِ حصیر تن پہ ایسے ہیں جوں اُتُو ہو

رکھیے گردن کو تری تیغِ ستم پر ہو سو ہو
جی ہیں ہم نے یہ کیا ہے اب مقرر، ہو سو ہو
قطرہ قطرہ اشکباری تا کجا پیشِ سحاب
ایک دن تو ٹوٹ پڑ اے دیدۂ تر ہو سو ہو

ظالم ہو میری جان، پہ نا آشنا نہ ہو
بے رحمی اتنی عیب نہیں، بے وفا نہ ہو
آزار کھینچنے کے مزے عاشقوں سے پوچھ
کیا جانے وہ کہ جس کا کہیں دل لگا نہ ہو
کھینچا ہے آدمی نے بہت دُور آپ کو
اس پردے میں خیال تو کر ٹک، خدا نہ ہو
جی میں تو ہے کہ دیکھیے آوارہ میر کو
لیکن خدا ہی جانے وہ گھر میں ہو یا نہ ہو

خدا کرے کہ بتوں سے نہ آشنائی ہو

کہ پھر موے ہی بنے ہے اگر جدائی ہو
بدن نما ہے ہر آئینہ لوحِ تربت کا
نظر جسے ہو اُسے خاک خود نمائی ہو
فرو نہ آئے سر اُس کا طوافِ کعبہ سے
نصیب جس کو ترے در کی جبہہ سائی ہو
ہزار موسمِ گل تو گئے اسیری میں
دکھائی دے ہے موے ہی پر اب رہائی ہو

پھولوں کے عکس سے نہیں جوے چمن میں رنگ
گل بہ چلے ہیں شرم سے اُس رُخ کی، آب ہو
یاں جُرم گنتے اُنگلیوں کے خط بھی مِٹ گئے
واں کس طرح سے دیکھیں ہمارا حساب ہو
لطفِ شراب ابر سے ہے سو تو، یا نصیب
جب لیویں جام ہاتھ میں تب آفتاب ہو
ہستی پر ایک دم کی تمھیں جوش اس قدر
اس بحرِ موج خیز میں تم تو حباب ہو
جی چاہتا ہے عیش کریں ایک رات ہم

تو ہو وے، چاندنی ہو، گلابی شراب ہو

جوشِ محیطِ عشق میں کیا جی سے گفتگو
اس گوہرِ گرامی سے اب ہاتھ دھو رہو

لائق نہیں تمھیں کہ ہمیں ناسزا کہو
پر ہے یہی ہمارے کیے کی سزا، کہو
چپکے رہے بھی چین نہیں تب کہے ہے یوں
لب بستہ بیٹھے رہتے جو ہو، مدعا کہو
اب نیک و بد پہ عشق میں مجکو نہیں نظر
اس میں مجھے بُرا کہو کوئی بھلا کہو
سر خاکِ آستاں پہ تمھارے رہا مدام
اس پر بھی، یاں نصیب، جو تم بے وفا کہو
صحبت ہماری اُس کی جو ہے، گفتنی نہیں
کیا کہیے گر کہے کوئی یہ ماجرا کہو

تم تو تصویر ہوتے دیکھ کے کچھ آئینہ

اتنی چُپ بھی نہیں ہے خوب، کوئی بات کرو
بس بہت وقت کیا شعر کے فن میں ضائع
میرؔ اب پیر ہوئے ترکِ خیالات کرو

جوں غُنچہ میرؔ اتنے نہ بیٹھے رہا کرو
گُل پھول دیکھنے کو بھی ٹک اُٹھ چلا کرو
ہوتے ہو بے دماغ تو دیکھو ہو ٹک ادھر
غصے ہی ہم پہ کاشکے اکثر رہا کرو
یہ اضطراب دیکھ کہ اب دُشمنوں سے بھی
کہتا ہوں اُس کے ملنے کی کچھ تم دعا کرو
ہر چند ساتھ جان کے ہے عشقِ میرؔ لیک
اس دردِ لاعلاج کی کچھ تو دوا کرو

بے طاقتی میں شب کی پوچھو نہ ضبط میرا
ہاتھوں میں دل کو رکھا، دانتوں تلے جگر کو
بھولا بھلا نہ اب تک ہرگز درختِ خواہش
برسوں ہوئے کہ دوں ہوں خونِ دل اس شجر کو

ہے روزگار میرا ایسا سیہ کہ یارو
مشکل ہے فرق کرنا ٹک شام سے سحر کو
ہر چند ہے سخن کو تشبیہ دُر سے، لیکن
باتیں مری سُنو تو تم پھینک دو گُہر کو

مطرب نے پڑھی تھی غزل اک میرؔ کی شب کو
مجلس میں بہت وجد کی حالت رہی سب کو
ہوگا کسو دیوار کے سائے میں پڑا میرؔ
کیا ربط محبت سے اُس آرام طلب کو

گیا کوچے سے تیرے اُٹھ کے میرؔ آشفتہ سر شاید
پڑا دیکھا تھا میں نے رہ میں اُس کے سنگِ بالیں کو

آنکھوں سے ہوئی خانہ خرابیٔ دل اے کاش
کر لیتے تبھی بند ہم ان دونوں دروں کو
پروازِ گلستاں کے تو شائستہ نہ نکلے
پروانہ نمط آگ ہم اب دیں گے پروں کو

اس باغ کے ہر گل سے جھپک جاتی ہیں آنکھیں
مشکل بڑی ہے آن کے صاحب نظروں کو
آدابِ جنوں چاہیے ہم سے کوئی سیکھے
دیکھا ہے بہت یاروں نے آشفتہ سروں کو

عنایتِ ازلی سے جو دل ملا مجکو
محلِ شکر ہے، آتا نہیں گلا مجکو
تنک شراب، ضعیف الدماغ ہوں ساقی
دمِ سحر مئی پرزور مست پلا مجکو
ہوا ہوں خاک، یہ دل کی وہی ہے ناصافی
ابھی اس آئنے کی کرنی ہے جِلا مجکو

مستی اُن آنکھوں سے نکلی ہے اگر دیکھو خوب
خلق بدنام عبث کرتی ہے جامِ مُل کو
جیسے ہوتی ہے کتاب ایک ورقِ ناقص
نسبتِ تام اسی طور ہے جُز سے کُل کو

جنبش بھی اُس کے آگے ہونٹوں کو ہو تو کہیو
یوں اپنے طور پر تم باتیں بہت بنا لو
دو نعروں ہی میں شب کے ہو گا مکاں ہُو کا
سُن رکھو کان رکھ کر یہ بات بستی والو
یارانِ رفتہ ایسے کیا دُور تر گئے ہیں
ٹک کر کے تیز گامی اس قافلے کو جا لو
یوں رفتہ اور بے خود کب تک رہا کرو گے
تم اب بھی میرؔ صاحب اپنے تئیں سنبھالو

ردیف ہ

یاد جب آتی ہے وہ زُلفِ سیاہ سانپ سا چھاتی پہ پھر جاتا ہے آہ
یار کا وہ ناز، اپنا یہ نیاز دیکھیے ہوتا ہے کیونکر یوں نباہ
دِین میں اُس کافرِ بے رحم کے اجر اک رکھتا ہے خونِ بے گناہ
رُوٹھ کر کیا آپ سے ملنے میں لطف ہووے وہ بھی تو کبھو ٹک عذر خواہ
ضبط بہتیرا ہی کرتے ہیں و لے آہ اک مُنہ سے نکل جاتی ہے گاہ

ظالم یہ کیا نکالی رفتار رفتہ رفتہ
اس چال پر چلے گی تلوار رفتہ رفتہ
پامال ہوں کہ اس میں ہوں خاک سے برابر
اب ہو گیا ہے سب کچھ ہموار رفتہ رفتہ
چاہت میں دخل مت دے زنہار آرزو کو
کر دے ہے دل کی خواہش بیمار رفتہ رفتہ

شہرِ چمن سے کچھ کم وحشتِ جنوں نہیں ہے

یاں گل ہیں دستہ دستہ واں خار رستہ رستہ

یوسف سے کوئی کیونکر اُس ماہ کو ملادے
ہے فرق رات دن کا از دیدہ تا شنیدہ
بندے کے دردِ دل کو کوئی نہیں پہنچتا
ہر ایک بے حقیقت یاں ہے خدا رسیدہ
سائے سے اپنے وحشت ہم کو رہی ہمیشہ
جوں آفتاب ہم بھی کیسے رہے جریدہ
منصور کی نظر تھی جو دار کی طرف، سو
پھل وہ درخت لایا آخر سرِ بریدہ
ذوقِ سخن ہوا ہے اب تو بہت ہمیں بھی
لکھ لیں گے میر جی کے کچھ شعر چیدہ چیدہ

تصدیع ایک دو دن ہووے تو کوئی کھینچے
تڑپے جگر ہمیشہ، چھاتی جلے ہمیشہ
کب تک وفا کرے گا یہ حوصلہ ہمارا
دل پیسے درد اکثر، غم جی ملے ہمیشہ

لطف کیا ہر کسو کی چاہ کے ساتھ
چاہ وہ ہے جو ہو نباہ کے ساتھ
جاذبہ تو ان آنکھوں کا دیکھو
جی کھنچے جاتے ہیں نگاہ کے ساتھ

باغباں بے رحم، گل بے دید، موسم بے وفا
آشیاں اس باغ میں بلبل نے باندھا کیا سمجھ

کھینچتا ہے دلوں کو صحرا کچھ
ہے مزا جوں میں اپنے سودا کچھ
ایسا ظاہر کا لطف ہے چھپنا
کم تماشا نہیں یہ پردا کچھ
وصل اُس کا خدا نصیب کرے
میرؔ دل چاہتا ہے کیا کیا کچھ

بو دنقش و نگار سا ہے کچھ
صورت اک اعتبار سا ہے کچھ

تو جو مہلت جسے کہے ہیں عمر
دیکھو تو انتظار سا ہے کچھ
مُنہ نہ ہم جبریوں کا کھلواؤ
کہنے کو اختیار سا ہے کچھ

کام کو مشکل دلِ پُر آرزو نے کر دیا
یاس کلی ہو چکے تو پھر نہیں اشکال کچھ

ذوقِ خبر میں ہم تو بے ہوش ہو گئے تھے
کیا جانے کب وہ آیا ہم کو نہیں خبر کچھ
وے دن گئے کہ بے غم کوئی گھڑی کٹے تھی
تھمتے نہیں ہیں آنسو اب تو پہر پہر کچھ
ان اُجڑی بستیوں میں دیوار و در ہیں کیا کیا
آثار جن کے یہ ہیں ان کا نہیں اثر کچھ
واعظ نہ ہو معارض نیک و بدِ جہاں میں
جو ہو سکے تو واعظ اپنا ہی فکر کر کچھ

ردیف :- ی

ہم سے دیکھا کہ محبت نے ادا کیا کیا کی
ایک دل قطرۂ خوں تس پہ جفا کیا کیا کی
سجدہ اک صبح ترے در کا کروں اس خاطر
میں نے محراب میں راتوں کو دعا کیا کیا کی

کچھ کر فکر مجھ دوانے کی
دھوم ہے پھر بہار آنے کی
دل کا اُس کنجِ لب سے دے ہیں نشاں
بات لگتی تو ہے ٹھکانے کی
تیزیوں ہی نہ تھی شبِ آتشِ شوق
تھی خبر گرم اُس کے آنے کی

غزل مسلسل

میر دریا ہے سُنے شعر زبانی اُس کی
اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اُس کی
ایک ہے عہد میں اپنے وہ پراگندہ مزاج
اپنی آنکھوں میں نہ آیا کوئی ثانی اُس کی

بات کی طرز کو دیکھو تو کوئی جادو تھا
پر ملی خاک میں کیا سحر بیانی اُس کی

اُس کا وہ عجز تمھارا یہ غرور خوبی
منتیں اُس نے بہت کیں پہ نہ مانی اُس کی

کچھ لکھا ہے تجھے ہر برگ پہ اے رشک بہار
رقعہ واریں ہیں یہ اوراق خزانی اُس کی

سرگزشت اپنی کس اندوہ سے شب کہتا تھا
سو گئے تم نہ سنی آہ کہانی اُس کی

مرثیے دل کے کئی کہہ کے دیئے لوگوں کو
شہرِ دلی میں ہے سب پاس نشانی اُس کی

آبلے کی سی طرح ٹھیس لگے پھوٹ بہے
دردمندی میں گئی ساری جوانی اُس کی

اب گئے اُس کے جز افسوس نہیں کچھ حاصل
حیف صد حیف کہ کچھ قدر نہ جانی اُس کی

مقدور تک تو ضبط کروں ہوں پہ کیا کروں
مُنہ سے نکل ہی جاتی ہے اک بات پیار کی

جی گیا اُس کے تیر کے ہمراہ   تھی تو اضع ضرور مہماں کی
سرِ دامن سے گفتگو کریے   بات بگڑی لبِ گریباں کی
آدمی سے ملک کو کیا نسبت   شان ارفع ہے میرؔ انساں کی

رکھا گنہ وفا کا تقصیر کیا نکالی
مارا خراب کر کے، تعزیر کیا نکالی
کی اُس طبیبِ جاں نے تجویزِ مرگِ عاشق
آزار کے مناسب تدبیر کیا نکالی
دل بند ہے ہمارا موجِ ہوائے گل سے
اب کے جنوں میں ہم نے زنجیر کیا نکالی
نامے پہ لوہو رو رو خط کھینچ ڈالے سارے
یہ میرؔ بیٹھے بیٹھے تحریر کیا نکالی

جی رشک سے گئے جو اُدھر کو صبا چلی
کیا کہیے آج صبح عجب کچھ ہوا چلی
کیا رنگ و بو و بادِ سحر سب ہیں گرمِ راہ
کیا ہے جو اس چمن میں ہے ایسی چلا چلی

یہ جور و جورکش تجھے کہاں آ گئے عشق میں
تجھ سے جفا، تو میر سے رسمِ وفا چلی

وہم جس کو محیط سمجھا ہے — دیکھیے تو سراب ہے وہ بھی
خانہ آباد کعبے میں تھا میر — اک خدائی خراب ہے وہ بھی

ق

دزدیدہ نگہ کرنا پھر آنکھ ملانا بھی
اس لوٹتے دامن کو پاس آ کے اٹھانا بھی
پامالیِ عاشق کو منظور رکھے جانا
پھر چال کڈھب چلنا، ٹھوکر نہ لگانا بھی
برقع کو اٹھا دینا پھر آدھے ہی چہرے سے
کچھ منہ کو چھپانا بھی کچھ جھمکی دکھانا بھی

یار بِن تلخ زندگانی تھی — دوستی مدعیِ جانی تھی
لطف پر اُس کے ہمنشیں مت جا — کبھو ہم پر بھی مہربانی تھی
میر کے قصے سے سب کی گئیں نیندیں — کچھ عجب طور کی کہانی تھی

شیب میں فائدہ تامل کا | سوچنا تب تھا جب جوانی تھی
کوے قاتل سے بچ کے نکلا خضر | اسی میں اُس کی زندگانی تھی
فقر پر بھی تھا میرؔ کے اک رنگ | کفنی پہنی، سو زعفرانی تھی

وہ رابطہ نہیں وہ محبت نہیں رہی
اُس بے وفا کو ہم سے ٹک اُلفت نہیں رہی
تھی تاب جی میں جب تئیں، رنج و تعب کھنچے
وہ جسم اب نہیں ہے وہ قدرت نہیں رہی
پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

عشق میں ذلت ہوئی، خفت ہوئی، تہمت ہوئی
آخر آخر جان دی یاروں نے یہ نوبت ہوئی
عکس اُس بے دید کا تو متصل پڑتا تھا صبح
دن چڑھے کیا جانوں کیا خورشید کی صورت ہوئی

قوت کو پیرانہ سر دِلی میں حیرانی ہوئی

اب کے جو آئے سفر سے خوب مہمانی ہوئی
باؤلے سے جب تلک بکتے تھے سب کرتے تھے پیار
عقل کی باتیں کیاں کیا ہم سے نادانی ہوئی
مرتبہ واجب کا سمجھے آدمی ممکن نہیں
فہم سودائی ہوا، یاں عقل دیوانی ہوئی
چاہ کر اُس بے وفا کو آخر اپنی جان دی
دوستی اُس کی، ہماری دشمنِ جانی ہوئی
غنچۂ گل ہے گلابی، پھول ہے جامِ شراب
توڑنے کو توڑی توبہ اب پشیمانی ہوئی

جفا اُس کی نہ پہنچی انتہا کو دریغا عمر نے کی بے وفائی

مطرب سے غزل میرؔ کی کل میں نے پڑھائی
اللہ رے اثر سب کے تئیں رفتگی آئی
گردش میں ہیں جو میرؔ مہ و مہر ستارے
دن رات ہمیں رہتی ہے یہ چشم نمائی

یوں تو مُردے سے پڑے رہتے ہیں ہم
پر وہ آتا ہے تو آجاتا ہے جی
آسماں شاید درے کچھ آگیا
رات سے کیا کیا رُکا جاتا ہے جی

دلیل اس بیاباں میں دل ہی ہے اپنا
نہ خضرِ دلبریاں، نہ رہبر نہ ہادی
مزا جوں میں پاس آگئی ہے ہمارے
نہ مرنے کا غم ہے نہ جینے کی شادی
وفا لوگ آپس میں کرتے تھے آگے
یہ رسمِ کہن آہ تم نے اُٹھادی
ملے قصرِ جنت میں پیرِ مغاں کو
ہمیں زیرِ دیوارِ میخانہ جادی

ردیف : ے

ابرِ رحمت ہے جوش میں مَی دے　　یعنی ساقی گناہ کر لیجے

تو گرفتار ہوں اس باغ کا رحم اے صیّاد
موسمِ گُل رہے جب تک مجھے مہلت دیجے

وہ میر شاہِ خوبی پھر قدر دُور اُس کی
درویشِ بے نوا کی اُس تک صدا نہ پہنچے

ہیں بد مزاج خوباں پر کس قدر ہیں دل کش
ہائے کہاں گلوں نے یہ مکھڑے پیارے پیارے
بے تابی ہے دنوں کو، بے خوابی ہے شبوں کو
آرام و صبر دونوں رخصت ہوئی سدھارے

اسیرِ زُلف کرے، قیدیِ کمند کرے

پسند اُس کی ہے، وہ جس طرح پسند کرے
ہمیشہ چشم ہے نَم ناک، ہاتھ دل پر ہے
خدا کسو کو نہ ہم سا بھی دردمند کرے
دکھا دے آنکھ کبھو، زُلف کھولے مُنہ پہ کبھو
کبھو خرام سے رستے کے رستے بند کرے
سخن یہی ہے جو کہتے ہیں شعرِ میرؔ ہے سحر
زبانِ خلق کو کس طور کوئی بند کرے

تازہ تر ہوتے ہیں تو گل سے بھی اے نازک نہال
صبح اُٹھتے ہیں بچھے جو پھول بستر کے ترے
کوئی آبِ زندگی پیتا ہے یہ زہر اب چھوڑ
خضر کو ہنستے ہیں سب مجروح خنجر کے ترے

بُو کیے کملاتے جاتے ہو نزاکت ہائے رے
ہاتھ لگنے میلے ہوتے ہو لطافت ہائے رے
عشق میں یاں افسوس سا افسوس اپنا کر چکے
زیرِ لب کہتے رہے ہم ایک مدت ہائے رے

دیکھنے ہی کے ہے قابل یار کی ترکیب میر
واہ وا رے چشم و ابروٗ قد و قامت ہائے وے

نظرمت بے پری پر کر کہ آں سوئے جہاں پھر ہوں
ہوئے پرواز کے قابل یہ ٹوٹے پر جہاں میرے
مجھے پامال کر یکساں کیا ہے خاک سے تو بھی
وہی رہتا ہے صبح و شام در پے آسماں میرے
سخن کیا میر کرتے حسرت و اندوہ و حرماں سے
بیاں حاجت نہیں، حالات ہیں سارے عیاں میرے

بہار آئی ہے غنچے گل کے نکلے ہیں گلابی سے
نہالِ سبز جھومے ہیں گلستاں میں شرابی سے
گِروں ہوں ہر قدم پر میں ڈہا جاتا ہے جی ہر دم
پہنچتا ہوں کبھو در پر ترے سو اس خرابی سے
بہت رویا نوشتے پر میں اپنے دیکھ قاصد کو
کہ سر ڈالے غریب آتا تھا خط کی بے جوابی سے

کھنچے ہیں جاں بلب تجھے ہم دورئ بتاں سے
آنے ایس پھر کے یار وایکے خدا کے یاں سے

تصویر کے سے طائر خاموش رہتے ہیں ہم
جی کچھ اُلٹ گیا ہے اب نالۂ و فغاں سے

جب کوندتی ہے بجلی تب جانبِ گلستاں
رکھتی ہے چھیڑ میری خاشاکِ آشیاں سے

کیا خوبی اُس کے مُنہ کی اے غنچہ نقل کریے
تُو تو نہ بول ظالم بُو آتی ہے وہاں سے

آنکھوں ہی میں رہے ہو دل سے نہیں گئے ہو
حیران ہوں یہ شوخی آئی تمھیں کہاں سے

اُتنی ہی بد مزاجی ہر لحظہ میرؔ تم کو
اُلجھاؤ ہے زمیں سے جھگڑا ہے آسماں سے

کرتا ہے کب سلوک وہ اہلِ نیاز سے
گفتار اُس کی کبر سے رفتار ناز سے

خاموش رہ سکے نہ تو بڑھکر بھی کچھ نہ کہہ
سر شمع کا کٹے ہے زبانِ دراز سے

شاید کہ آج رات کو تھے میکدے میں میر
کھیلے تھا ایک مغبچہ مُہرِ نماز سے

تابوت مرا دیر اُٹھا اُس کی گلی سے
اثبات ہوا جُرمِ محبت کا اسی سے
تم چھیڑتے ہو بزم میں مجکو تو ہنسی سے
پر مجھ پہ جو ہو جائے ہے پوچھو مرے جی سے
ہمسائے مجھے رات کو رویا ہی کرے ہیں
سوتے نہیں بے چارے مری نالہ کشی سے
اُس شوخ کا تمکین سے آنا ہے قیامت
اُکتانے لگے ہمنفساں تم تو ابھی سے

ہُشیار کہ ہے راہ محبت کی خطرناک
مارے گئے ہیں لوگ بہت بے خبری سے
عشق آنکھوں کے نیچے کیے کیا میر چھپے ہے
پیدا ہے محبت تری مژگاں کی تری سے

ڈنبالِ ہر نگاہ ہے صد کاروانِ اشک
برسے ہے ابرِ چشم بڑی دُھوم دھام سے

وہ کہاں دھوم جو دیکھی گئی چشمِ تر سے
ابر کیا کیا اُٹھے ہنگامے سے کیا کیا برسے
ہو برافروختہ وہ بُت جو مئے احمر سے
آگ نکلے ہے تماشے کے تئیں پتھر سے
تھا نوشتے میں کہ یوں سوکھ کے مریے اُس بن
استخواں تن پہ نمودار ہیں سب مسطر سے

مرا دل پیر و مرشد ہے مجھے ہے اعتقاد اُس سے
فراموش آپ کو کرنا محبت میں ہے یاد اُس سے
بلا انداز ہے اُس کا قیامت ناز ہے اُس کا
اُٹھے فتنے ہزار اُس سے ہوئے لاکھوں فساد اُس سے
ادھر توبہ کرے ہے میرؔ اُدھر لگتا ہے مَے پینے
کہاں تک اب تو اپنا اُٹھ گیا ہے اعتماد اُس سے

بھری آنکھیں کسی کی پونچھتے جو آستیں رکھتے
ہوئی شرمندگی کیا کیا ہمیں اس دستِ خالی سے

دماغِ حرف، لعلِ ناب و برگِ گل سے ہے تم کو
ہمیں جب گفتگو ہے تب کسو کے لب کی لالی سے

سجدہ کوئی کرے تو درِ یار پر کرے
ہے جا نے پاک شرط عبادت کے واسطے

دیوانگی میں گاہ ہنسے گاہ رو چکے
وحشت بہت تھی طاقتِ دل ہاے کھو چکے

اب چمن میں جا نکلتے ہیں تو جی لگتا نہیں
پھول گل سے میرؔ اُس بِن دل بہت بہلا چکے

خمیازہ کش رہے ہے اے میرؔ شوق سے تو
سینے کے زخم کے کہہ کیونکر رہیں گے ٹانکے

دل خوں ہوا ہمارا ٹکڑے ہوئے جگر کے
دیکھا نہ تم نے ایدھر صرفے سے اک نظر کے
رہنے کی اپنی جا تو نے دَیر ہے نہ کعبہ
اُٹھیے جو اُس کے دَر سے تو ہوجیے کدھر کے
خاک ایسی عاشقی پر ٹھکرانے بھی گئے کل
پاؤں کنے سے اُس کے پر میرؔ جی نہ سر کے

اس باغِ بے ثبات میں کیا دل صبا لگے
کیا کیا نہال دیکھتے یاں پاؤں آ لگے
حرص و ہوس سے باز رہے دل تو خوب ہے
ہے قہر اس کلی کے تئیں گر ہوا لگے
کس کو خبر ہے کشتی تباہوں کے حال کی
تختہ مگر کنارے کوئی بہ کے جا لگے
مقصود کے خیال میں بہتوں نے چھانی خاک
عالم تمام وہم ہے یاں ہاتھ کیا لگے

غیر کو دیکھے ہے گرمی سے نہ کچھ لاگ لگے

اس لیے دیکھ رہے ہے کہ مجھے آگ لگے

ناتوانی سے اگر مجھ میں نہیں ہے دَم تو کیا
عشق جو چاہے تو مر دے سے بھی اپنا کام لے
شاخِ گل تیری طرف جُھکتی جو ہے اے مستِ ناز
چاہتی ہے تو بھی اُس کے ہاتھ سے اک جام لے
ہمنشیں مت کہہ، بتوں کی میر کو تسبیح ہے
کام کیا اس ذکر سے اُن کو، خدا کا نام لے

سختیاں کھینچیں سو کھینچیں پھر بھی جو اُٹھ کر چلے
چلتے اُس کوچے سے ہم پر سیکڑوں پتھر چلے

یا پہلی وے نگاہیں جن سے کہ چاہ نکلے
یا اب کی وے ادائیں جو دل سے آہ نکلے
یاں مہر تھی، وفا تھی، واں جور تھے، ستم تھے
پھر نکلے بھی تو میر سے یہ ہی گناہ نکلے

یہ نہیں میں جانتا نسبت ہے کیا آپس میں لیک
آنکھیں ہو جاتی ہیں ٹھنڈی اُس کے تلووں سے ملے
ہائے کس حسرت سے شبنم نے سحر رو کر کہا
خوش رہو اے ساکنانِ باغ اب تو ہم چلے

بے مہر و وفا ہے وہ کیا رسمِ وفا جانے
اُلفت سے محبّت سے مل بیٹھنا کیا جانے
دل دھڑکے ہے جاتے کچھ بُت خانے سے کعبے کو
اس راہ میں پیش آوے کیا ہم کو خدا جانے
میں ہی بھی لے جاؤں در وانے کی اُس کے تو
اس دردِ محبّت کی جو کوئی دوا جانے
اپنے تئیں بھی کھانا خالی نہیں لذّت سے
کیا جانے ہوس پیشہ چکھے تو مزا جانے

جو خواہش نہ ہوتی تو کاہش نہ ہوتی
ہمیں جی سے مارا تری آرزو نے
نہ بھائیں تجھے میری باتیں، وگرنہ

رکھی دھوم شہروں میں اس گفتگو نے
مداوا نہ کرنا تھا مشفق ہمارا
جراحت جگر کے لگے دُکھنے دونے
تری چال ٹیڑھی، تری بات رُوکھی
تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسو نے

کیا رفتگی سے میری تم گفتگو کرو ہو
کھویا گیا نہیں ہیں ایسا کہ کوئی پاوے
چھاتی کے داغ اکثر آنکھوں سے کھل رہے ہیں
دیکھیں ابھی محبت کیا کیا ہمیں دکھاوے

یا بادۂ گلگوں کی خاطر سے ہوس جاوے
یا ابر کوئی آوے اور آکے برس جاوے
دل تو ہے عبث نالاں یارانِ گزشتہ بن
ممکن نہیں اب اُن تک آوازِ جرس جاوے

اُس شوخ ستمگر کو کیا کوئی بھلا چاہے

جو چاہنے والے کا ہر طور برا چاہے
کعبے گئے کیا کوئی مقصد کو پہنچتا ہے
کیا سعی سے ہوتا ہے جب تک نہ خدا چاہے
سو رنگ کی جب خوبی پاتے ہیں اُسی گل میں
پھر اُس سے کوئی اُس بن چاہے بھی تو کیا چاہے
رنگِ گل و بوئے گل ہوتے ہیں ہوا دونوں
کیا قافلہ جاتا ہے جو تو بھی چلا چاہے
ہم میرؔ ترا مرنا کیا چاہتے تھے لیکن
رہتا ہے ہوئے بن کب جو کچھ کہ ہوا چاہے

دُوری میں اُس کی گور کنارے ہم آ رہے
جی رات دن جھنوں کے پیں اُن ہم کیا رہے
اُس آفتابِ حُسن کے ہم داغِ شرم ہیں
ایسے ظہور پر بھی جو منہ کو چھپا رہے
اب جس کے حُسنِ خلق پہ بھولے پھرے ہیں لوگ
اُس بے وفا سے ہم بھی بہت آشنا رہے
کُشتے ہیں ہم تو ذوقِ شہیدانِ عشق کے

تیغِ ستم کو دیر گلے سے لگا رہے
آتے کبھو جو واں سے تو یاں رہتے تھے اُداس
آخر کو میرؔ اُس کی گلی ہی میں جا رہے

اک عمر دیدہ ہائے ستمدیدہ تر رہے
آخر کو پھوٹ بہے' قہر کر رہے
مرغانِ باغ رہتے ہیں اب گھیرے یوں مجھے
ماتم زدوں کے حلقے میں جوں نوحہ گر رہے
آغوش اُس سے خالی رہی شب کہ تا سحر
جیب و کنار گریۂ خونیں سے بھر رہے
اب صبر و ہوش و عقل کی میرؔ سے یہ ہے معاش
جوں قافلہ لُٹا کہیں آ کر اُتر رہے

تھا ملک جن کے زیرِ نگیں صاف مٹ گئے
تم اس خیال میں ہو کہ نام و نشاں رہے
آنسو چلے ہی آنے لگے منہ پہ متصل
کیا کیجیئے کہ رازِ محبت نہاں رہے

مقصود گُم گیا ہے تب ایسا ہے اضطراب
چکر ہیں ورنہ کاہے کو یوں آسماں رہے

اب تو ہم ہو چکتے ہیں ٹک تیرے ابرو خم ہوتے
کیا کیا رنج اُٹھاتے تھے جب جی میں طاقت رکھتے تھے
چاہ کے سارے دیوانے پر آپ سے اکثر بیگانے
عاشق اُس کے سیر کیے ہم سب سے جُدی اَٹ رکھتے تھے
کام کرے کیا سعی و کوشش مطلب یاں ناپیدا ہے
دست و پا بہتیرے مارے جب تک قدرت رکھتے تھے

شمس و قمر کے دیکھے جی اُس میں جا رہے ہے
اُن دلفروز کے بھی رُخسار ایسے ہی تھے
ہو جائے کیوں نہ دوزخ باغِ زمانہ ہم پر
ہم بے حقیقتوں کے کردار ایسے ہی تھے

ق
پھولوں کی سیج پر سے جو بے دماغ اُٹھے

مسند پہ ناز کی جو تیوری چڑھا کے بیٹھے
کیا غم اُسے زمیں پہ بے برگ و ساز کوئی
خار و خسک ہی کیوں نہ برسوں بچھا کے بیٹھے

ہے جنبشِ لب مشکل جب آن کے وہ بیٹھے
جو چاہیں سو یوں کہہ لیں لوگ اپنی جگہ بیٹھے
کیا رنگ میں شوخی ہے اُس کے تنِ نازک کے
پیراہن اگر پہنے تو اُس پہ بھی نہ بیٹھے

اب سمجھ آئے، مرتبا سمجھے　　گم کب خود کے تئیں خدا سمجھے
اس قدر جی میں ہے دغا اُس کے　　کہ دُعا کریے تو دغا سمجھے
نکتہ داں بھی خدا نے تم کو کیا　　پر ہمارا نہ مدعا سمجھے
لکھے دفتر کتابیں کیں تصنیف　　پر نہ طالع کا ہم لکھا سمجھے
میر صاحب کا ہر سخن ہے رمز　　بے حقیقت ہے شیخ کیا سمجھے

سُنتے تھے کہ جاتی ہے ترے دیکھنے سے جاں
اب جان چلی جاتی ہے ہم دیکھتے ہیں ہائے

کیا روتے ہیں یارانِ گزشتہ کے لیے ہم
جب راہ میں کچھ نقشِ قدم دیکھتے ہیں ہاے

جاگنا تھا ہم کو سو بیدار ہوتے رہ گئے
کارواں جاتا رہا ہم ہاے سوتے رہ گئے
جی دیے بن وہ دُرِ مقصود کب پایا گیا
بے جگر تھے میر صاحب جان کھوتے رہ گئے

گُل گئے، بُوٹے گئے، گلشن ہوئے برہم گئے
کیسے کیسے ہاے اپنے دیکھتے موسم گئے
ہنستے رہتے تھے جو اس گلزار میں شام و سحر
دیدۂ تر ساتھ لے وے لوگ جوں شبنم گئے
جی گیا یاں بے دماغی سے انھوں کی اور واں
نے جبیں سے چیں گئی نے ابروؤں سے خم گئے
شاید اب ٹکڑوں نے دل کے قصد آنکھوں کا کیا
کچھ سبب تو ہے جو آنسو آتے آتے تھم گئے
سبزہ و گل خوش نشینی اس چمن کی جن کو تھی

سوبھی تو دیکھا گریباں چاک و مژگاں نم گئے
ربط صاحب خانہ سے مطلق بہم پہنچا نہ میرؔ
مدتوں سے ہم حرم میں تھے پہ نامحرم گئے

کام کیا بالِ ہما سے چترِ شہ سے کیا غرض
سر پہ اک دیوار ہی کا اُس کی سایا چاہیے
اتقا پر خانقہ والے بہت مغرور ہیں
منتِ ناز ادھر اُسے یکبار لایا چاہیئے
یہ ستم تازہ کہ اپنی نا کسی پر کر نظر
جن سے بگڑا چاہیے اُن سے بنایا چاہیئے
گاہ برقع پوش ہو گہ مو پراگندہ کرو
تم کو ہم سے منھ بہرصورت چھپایا چاہیئے

انکھڑیوں کو اُس کی خاطر خواہ کیونکر دیکھیے
سو طرف جب دیکھ لیجے تب ٹک ادھر دیکھیے
اشک پر سُرخی ابھی سے ہے تو آگے ہمنشیں
رنگ لا دے کیسے کیسے "دیدۂ تر" دیکھیے

گرداب وار یار ترے صدقے جائیے
دریا کا پھیر پائیے تیرا نہ پائیے
تاثیر ہے دعا کو فقیروں کی میرجی
ٹک آپ بھی ہمارے لیے ہاتھ اُٹھائیے

ساکنِ دیر و حرم دونوں تلاشی ہیں ترے
تو خدا جانے کہاں ہے کیونکے تجکو پائیے
دُور ہی سے ہوش کھو دیتی ہے اُس کی بوے خوش
آپ میں رہیے تو اُس کے پاس بھی ٹک جائیے

پَر نہیں جو اُڑ کے اُس دَر جائیے　　زندگانی حیف ہے مرجائیے
قصد ہے کعبے کا لیکن سوچ ہے　　کیا ہے مُنھ جو اُس کے در پہ جائیے

ان دلبروں کو دیکھ لیا بے وفا ہیں یے
بے دید و بے مروت و نا آشنا ہیں یے

شوق ہم کو کھپائے جاتا ہے　　جان کو کوئی کھائے جاتا ہے

ہر کوئی اس مقام پہ دَس روز
اپنی نوبت بجائے جاتا ہے
جائے عبرت ہے خاکدانِ جہاں
تُو کہاں مُنھ اُٹھائے جاتا ہے
دیکھ سیلاب اس بیاباں کا
کیسا سر کو جُھکائے جاتا ہے

کبھو میر اس طرف آکر جو چھاتی کوٹ جاتا ہے
خدا شاہد ہے اپنا تو کلیجا ٹوٹ جاتا ہے
خرابی دل کی کیا انبوہِ دردو غم سے پوچھو ہو
وہی حالت ہے جیسے شہر لشکر لوٹ جاتا ہے
شکست اس رنگ آئی بے خودیٔ عشق میں دل پر
نشے میں مَست سے جیسے کہ شیشہ پھُوٹ جاتا ہے

چمن کو یاد کر مرغِ قفس فریاد کرتا ہے
کوئی ایسا ستم دُنیا میں اے صیاد کرتا ہے
ادھر اے نقشِ شیریں بے ستوں اُوپر تماشا کر
کہ کارستانیاں تیرے لیے فرہاد کرتا ہے

کیا جانیے کہ چھاتی جلے ہے کہ داغِ دل

اک آگ سی لگی ہے کہیں کچھ دھواں سا ہے

رہے خیال نہ کیوں ایسے ماہ طلعت کا
اندھیرے گھر کا ہمارے وہی اُجالا ہے
دلوں کو کہتے ہیں ہوتی ہے راہ آپس میں
طریقِ عشق بھی عالم سے کچھ نرالا ہے

چھاتی جلا کرے ہے سوزِ دروں بلا ہے
اک آگ لگ رہی ہے کیا جانیے کہ کیا ہے
مَیں اَور تُو ہیں دونوں مجبور طور اپنے
پیشہ ترا جفا ہے شیوہ مرا وفا ہے
روئے سخن ہے کیدھر اہلِ جہاں کا یارب
سب متفق ہیں اس پر ہر ایک کا خدا ہے
کچھ بے سبب نہیں ہے خاطر مری پریشاں
دل کا الم جُدا ہے غم جان کا جُدا ہے
شادی سے غم جہاں میں دَہ چند ہم نے پایا
ہے عید ایک دن تو دس دن یہاں دَہا ہے

ہے خصمِ جانِ عاشق وہ محوِ ناز لیکن
ہر لمحہ بے ادائی یہ بھی تو اک ادا ہے

ہو جائے یاس جس میں سو عاشقی ہے ورنہ
ہر رنج کو شفا ہے ہر درد کی دوا ہے

نایاب اس گہر کی کیا ہے تلاش آساں
جی ڈوبتا ہے اُس کا جو تہ سے آشنا ہے

پھرتے ہو میرؔ صاحب سب سے جدا جدا تم
شاید کہیں تمہارا دل ان دنوں لگا ہے

ہمارا تو ہے اصلِ مدعا تو
خدا جانے ترا کیا مدعا ہے

محبت کشتہ ہیں ہم یاں کسو پاس
ہمارے درد کی بھی کچھ دوا ہے

حرم سے دیر اُٹھ جانا نہیں عیب
اگر یاں ہے خدا واں بھی خدا ہے

نہیں ملتا سخن اپنا کسو سے
ہماری گفتگو کا ڈھب جدا ہے

کب اُس بیگانہ خو کو سمجھے عالم
اگرچہ یارِ عالم آشنا ہے

نہ عالم میں ہے نے عالم سے باہر
یہ سب عالم سے عالم ہی جدا ہے

لگا میں گردِ سر پھرنے تو بولا
تمہارا میرؔ صاحب سر پھرا ہے

شور میرے جنوں کا جس جا ہے
دخلِ عقل اُس مقام میں کیا ہے

شور بازار میں ہے یوسف کا
وہ بھی آ نکلے تو تماشا ہے

ٹک گریباں میں سر کو ڈال کے دیکھ
دل بھی دامن وسیع صحرا ہے

ڈر کیوں نہ محلّے میں رہے رونے سے میرے
سیلاب نے اس کوچے میں گھر مول لیا ہے

پلکوں سے رفو اُن نے کیا چاکِ دلِ میرؔ
کس زخم کو کس نازکی کے ساتھ سیا ہے

پہنچا بہم علاقہ اے غُزلتی کسو سے
کرنا معاش اکیلے اتنا کمال کیا ہے

سرگرمِ جلوہ اُس کو دیکھے کوئی سو جانے
طرزِ خرام کیا ہے حُسن و جمال کیا ہے

گہ آپ میں نہیں ہو گہ منتظر کہیں ہو
یہ میرؔ جی تمھارا ان روزوں حال کیا ہے

ہر طرف بحث تجھ سے ہے اے عشق
شکر تیرا ، تری شکایت ہے

دہر کا ہو گلہ کہ شکوۂ چرخ اُس ستمگر ہی سے کنایت ہے
کب ملے میرؔ ملک داروں سے وہ گدائے شہِ ولایت ہے

کیا جانیئے کہ عشق میں خوں ہو گیا کہ داغ
چھاتی میں اب تو دل کی جگہ ایک درد ہے

جانے میں قتل گہ سے ترا اختیار ہے
پر جانیں جو گئی ہیں سو رہ پُرغبار ہے
ہم آپ سے گئے سو الٰہی کہاں گئے
مُدت ہوئی کہ اپنا ہمیں انتظار ہے
کل سروِ تازہ باغ میں آیا نظر مجھے
میں نے فریبِ شوق سے جانا کہ یار ہے

جنوں کا عبث میرے مذکور ہے
جوانی دوانی ہی مشہور ہے
گدا شاہ دونوں ہیں دل باختہ
عجب عشق بازی کا دستور ہے

نیاز اپنا جس مرتبے میں ہے یاں
اسی مرتبے میں وہ مغرور ہے

پھٹ لینا سر، گئے دل کے، شروعِ عشق تھا
سینہ کوبی متصل ہے اب یہ ماتم اور ہے

بیڑے کھاتا ہے تو آتا ہے نظر پان کا رنگ
کس قدر ہائے رے وہ جلدِ گلو نازک ہے

لطف اُس کے بدن کا کچھ نہ پوچھو — کیا جانیے جان ہے کہ تن ہے
گہ دیر میں ہیں گہے حرم میں — اپنا یہی تو دوانہ پن ہے
ہم کُشتۂ عشق ہیں، ہمارا — میدان کی خاک ہی کفن ہے
کر میرؔ کے حال پر ترحم — وہ شہر غریب و بے وطن ہے

ہم مست ہو بھی دیکھا آخر مزا نہیں ہے
ہشیاری کے برابر کوئی نشا نہیں ہے
شوقِ وصال ہی میں جی کھپ گیا ہمارا

باآنکہ ایک دم وہ ہم سے جُدا نہیں ہے
زیرِ فلک رُکا ہے اب جی بہت ہمارا
اس بے فضا قفس میں مطلق ہوا نہیں ہے
ہر صبح اُٹھ کے تجھ سے مانگوں ہوں میں تجھی کو
تیرے سوائے میرا کچھ مدعا نہیں ہے
تھیں پیش از آشنائی کیا آشنا نگاہیں
اب آشنا ہوئے پر آنکھ آشنا نہیں ہے

کیا تنِ نازک ہے جاں کو بھی حسد جس تن پہ ہے
کیا بدن کا رنگ ہے تہ جس کی پیراہن پہ ہے
وے بھری پلکیں اُلٹ دیتی ہیں صف اک آن میں
اب لڑائی ہند میں سب اُس سیہ پلٹن پہ ہے
تُو تو کہتا ہے کہ میں نے اُس طرف دیکھا نہیں
خونِ ناحق میرؔ کا یہ کس کی پھر جیتون پہ ہے

یہ رات ہجر کی یاں تک تو دُکھ دکھاتی ہے
کہ صبح تک مری سب کو بھول جاتی ہے

نہیں ٹک بیٹھنے دیتے تم اپنی بزم میں ہم کو
مروّت رسم تھی مُدّت کی سو تم نے اُٹھا دی ہے

تپش سے رنگ اُڑا جاوے قلق سے جان گھبرائے
دیا ہے دل الٰہی یا ہمیں کوئی بلا دی ہے

کوئی صورت نہیں اس گھر سے اب تیرے نکلنے کی
قیامت کی ہے جن نے آرسی تجکو دکھا دی ہے

کجیٔ ذہن اس وادی میں گمراہی کا ہے باعث
سلیم الطبع کو تو یاؤں کا ہر نقش ہادی ہے

نہ کٹتی ٹک نہ ہوتی گر فقیری ساتھ اُلفت کے
ہمیں جب اُن نے گالی دی ہے تب ہم نے دعا دی ہے

ہے چشمک انجم طرف اُس مہ کے اشارہ
دیکھو تو مری آنکھ کہاں جا کے لڑی ہے

وہ زُلف نہیں منعکسِ دیدۂ تر میں
اس بحر میں اشعار سے زنجیر پڑی ہے

اس منزلِ دلکش کو منزل نہ سمجھیے گا

خاطر میں رہے یاں سے دریش سفر کبھی ہے
کو فت سے جان لب پہ آئی ہے
ہم نے کیا چوٹ دل پہ کھائی ہے
لکھتے رقعہ لکھے گئے دفتر
شوق نے بات کیا بڑھائی ہے
دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے
ہے تصنع کہ لعل ہیں وے لب
یعنی اک بات سی بنائی ہے
دل سے نزدیک اور اتنا دور
کس سے اُس کو کچھ آشنائی ہے
بے ستوں کیا ہے کوہکن کیسا
عشق کی زور آزمائی ہے
یاں ہوئے خاک سے برابر ہم
واں وہی نازِ خود نمائی ہے
مرگِ مجنوں سے عقل گم ہے میرؔ
کیا دوانے نے موت پائی ہے

اُس شوخ سے ہمیں بھی اب یاری ہوگئی ہے
شرم انکھڑیوں میں جس کی عیاری ہوگئی ہے
مطلق اثر نہ دیکھا مدت کی آہ و زاری
اب نالہ و فغاں سے بیزاری ہوگئی ہے

کیا پوچھتے ہو عاشق راتوں کو کیا کرے ہے
گاہے بکا کرے ہے، گاہے دعا کرے ہے
ہم طورِ عشق سے تو واقف نہیں ہیں، لیکن
سینے میں جیسے کوئی دل کو ملا کرے ہے
سمجھا ہے یہ کہ مجکو خواہش ہے زندگی کی
کس ناز سے معالج میری دوا کرے ہے
گہ سرگزشت اُن نے فرہاد کی نکالی
مجنوں کا گاہے قصہ بیٹھا کہا کرے ہے
ایک آفتِ زماں ہے یہ میرؔ عشق پیشہ
پردے میں سارے مطلب اپنے ادا کرے ہے

کس کو کہتے ہیں نہیں میں جانتا اسلام و کفر

دَیر ہو یا کعبہ مطلب مجکو تیرے دَر سے ہے

کارِ دل اُس مہ تمام سے ہے
کاہش اک روز مجکو شام سے ہے
تم نہیں فتنہ ساز، سچ صاحب
شہر پُرشور اس غلام سے ہے
بوسہ لے کر سرک گیا کل مَیں
کچھ کہو، کام اپنے کام سے ہے
کوئی تجھسا بھی کاش تجکو ملے
مدعا ہم کو انتقام سے ہے
شعر میرے ہیں سب خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے
سہل ہے میرؔ کا سمجھنا کیا
ہر سخن اُس کا اک مقام سے ہے

گو کہ پردا کرے جوں ماہِ شبِ ابر وہ شوخ
کب چھُپا رہتا ہے ہر چند چھُپا نکلے ہے

لگ چلی ہے مگر اُس گیسوئے عنبر بُو سے
نازکرتی ہوئی اس راہ صبا نکلے ہے
کیا ہے اقبال کہ اُس دُشمنِ جاں کے آتے
مُنھ سے ہر ایک کے سو بار دعا نکلے ہے

ٹک رُک کے صاف طینت نکلے ہے اور کچھ ہو
پانی گرہ جو ہووے تو پھر گُہر بنے ہے
نکلے ہے صبح بھی یاں صندل ملے جبیں کو
عالم میں کام کس کا بے دردِ سر بنے ہے
برسوں لگی رہے ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں
تب کوئی ہم سا صاحب، صاحب نظر بنے ہے
یارانِ دَیر و کعبہ دونوں بلا رہے ہیں
اب دیکھیں میر اپنا جانا کدھر بنے ہے

دیوانِ سوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیوانِ سوم

میرے مالک نے مرے حق میں یہ احسان کیا
خاکِ ناچیز تھا میں سو مجھے انسان کیا
مجکو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے
دردؔ و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

دین و دل کے غم کو آساں ناتواں ہیں لے گیا
یا محبت کہہ کے یہ بارِ گراں ہیں لے گیا
عرصۂ دشتِ قیامت باغ ہو جاے گا سب
اس طرح سے جو یہ چشمِ خوں فشاں ہیں لے گیا
ذکر دل جانے کا وہ پُر کینہ سُن کہنے لگا
یہ سُنا تھے ہو کسے، کیا مہرباں ہیں لے گیا
یک جہاں مہر و وفا کی جنس تھی میرے کنے

لیکن اُس کو پھیر ہی لایا جہاں میں لے گیا
ریختہ کا ہے کو تھا اس رُتبۂ عالی میں میر
جو زمیں نکلی اُسے تا آسماں میں لے گیا

میرا ہی مقلّدِ عمل تھا مجنوں کے دماغ میں خلل تھا
دل ٹوٹ گیا تو خوں نہ نکلا یہ شیشہ بہت ہی کم بغل تھا
کیا قدر ہے ریختے کی گو میں اس فن میں نظیری کا بدل تھا
تھا نزع میں دستِ میر دل پہ شاید غم کا یہی محل تھا

شب شمع کو بھی جھپکی مجلس میں لگ گئی تھی
سرگرمِ شوقِ مُردن جس دم پتنگ آیا
بشرے کی اپنی رونق لے میر عارضی ہے
جب دل کو خوں کیا تو چہرے پہ رنگ آیا

دل اگر کہتا ہوں تو کہتا ہے وہ یہ دل ہے کیا
ایسے ناداں دلربا سے ملنے کا حاصل ہے کیا
جاننا باطل کسو کو یہ قصورِ فہم ہے

حق اگر سمجھو تو سب کچھ حق ہے یاں باطل ہے کیا
یاں کوئی دن رات وقفہ کرکے قصد آگے کا کر
کاروان گاہِ جہانِ رفتنی منزل ہے کیا
تک رہے ہیں اُس کو سو ہم تک رہے ہیں ایک سے
دیدۂ حیراں ہمارا دیدۂ بسمل ہے کیا
وہ حقیقت ایک ہی ساری نہیں ہے سب میں تو
آب سا ہر رنگ میں یہ اور کچھ شامل ہے کیا
چوٹ میرے دل میں ایسی ہے کہ میں ہوں دم بخود
وہ کشندہ یوں بھی کہتا ہے کہ تو گھائل ہے کیا
ہم تو سو سو بار مر رہتے ہیں ایک ایک آن میں
عشق میں اُس کے گزرنا جان سے مشکل ہے کیا

ان دلبروں سے رابطہ کرنا ہے، کام کیا
کر اک سلام پوچھنا "صاحب کا نام کیا"
شکرِ خدا کہ سر نہ فرو لائے ہم کہیں
کیا جانیں سجدہ کہتے ہیں کس کو سلام کیا
اُس کُنجِ لب پہ چپکے ہوئے مُنھ کو رکھ کے ہم

دلچسپ اس مقام میں حرف و کلام کیا

چال یہ کیا تھی کہ ادھر کو گزارا نہ کیا
دُور ہی دُور پھرے پاس ہمارا نہ کیا
اُس کو منظور نہ تھی ہم سے محبت کرنی
ایک چشمک ہی نہ کی، ایک اشارا نہ کیا
لے گیا سٹی بھی دروازے کی اُن کے ہیں تیر
پراطبّا نے مرے دَرد کا چارا نہ کیا

اب یہ نظر پڑے ہے کہ برگشتہ وہ مژہ
کاوش کرے گی ٹک بھی تو سنبھلا نہ جائے گا
اُڑتی پھرے گی خاک، جنوں کرتی دشت دشت
کچھ دست اگر یہ بے سر و ساماں بھی پائے گا

وہ جو گلشن میں جلوہ ناک ہوا
پھول غیرت سے جل کے خاک ہوا
اُس کے دامن تلک نہ پہنچا ہاتھ
تھا سرِ دست جیب، چاک ہوا

پہلے گلے لگایا، پھر دستِ جور اُٹھایا
مارا تو اُن نے لیکن احسان کر کے مارا

گیا حسن خوبانِ بدراہ کا — ہمیشہ رہے نام اللہ کا
پشیماں ہوا دوستی کر کے میں — بہت مجکو ارمان تھا چاہ کا
اسیری کا دیتا ہے مژدہ مجھے — مرا زمزمہ گاہ و بےگاہ کا
نکو ہیں اگر آنکھ تیری ہو میرؔ — تماشا کر اُس کی نظرگاہ کا

چشم سے خوں ہزار نکلے گا — کوئی دل کا بخار نکلے گا
اُس کی نخچیرگہ سے روح الامیں — ہو کے آخر شکار نکلے گا
عزلتِ میرؔ عشق میں کب تھی — ہو کے بے اختیار نکلے گا

اعجاز مُنہ تکے ہے ترے لب کے کام کا
کیا ذکر یاں مسیح علیہ السلام کا
رقعہ ہمیں جو آوے ہے سو تیر میں بندھا
کیا دیجیے جواب اجل کے پیام کا

پُھپکے دیکھو جھمکتے وہ لبِ سُرخ
ذکر یاں کیا ہے لعل و مرجاں کا

اُس نرگسِ مستانہ کو کر یاد کڑھوں ہوں
کیا گریۂ سرشار مجھے بے سبب آیا
جاتا تھا چلا راہ عجب حال سے کل میرؔ
دیکھا اُسے جس شخص نے اُس کو عجب آیا

کیا کام کیا ہم نے دل یوں نہ لگانا تھا
اس جان کی جوکھوں کو اُس وقت نہ جانا تھا
ہر آن تھی سرگوشی یا بات نہیں گاہے
اوقات ہے اک یہ بھی، اک وہ بھی زمانا تھا
کیونکر گلی سے اُس کی مَیں اُٹھ کے چلا جاتا
یاں خاک میں ملنا تھا، لوہو میں نہانا تھا
جب تو نے نظر پھیری تب جان گئی اُس کی
مرنا ترے عاشق کا مرنا کہ بہانا تھا
کہتا تھا کسو سے کچھ، تکتا تھا کسو کا مُنہ

کل میرؔ کھڑا تھا یاں، سچ ہے کہ دِوانا تھا

مت سہل ہمیں سمجھو، پہنچے تھے بہم تب ہم
برسوں تئیں گردوں نے جب خاک کو چھانا تھا
ہو باغ و بہار آیا، گُل پھول کہیں پایا
جلوہ اُسنے یاں اپنا صد رنگ دکھانا تھا

یاں اپنے جسمِ زار پہ تلوار سی لگی
اُن نے جو بے دماغی سے ابرو کو خم کیا

اب کے جو گُل کی فصل میں ہم کو جنوں ہوا
وہ دل کہ جس پہ اپنا بھروسا تھا، خوں ہوا
تھا شوقِ طوفِ تربتِ مجنوں مجھے بہت
اک گرد بادِ دشت مرا رہنموں ہوا

رات سے آنسو مری آنکھوں میں پھر آنے لگا
اک رمق جی تھا بدن میں سو بھی گھبرانے لگا

حیف میں اُس کے سخن پر ٹک نہ رکھا گوش کو
یوں تو ناصح نے کہا تھا دل نہ دیوانے لگا

چشمک اُس مہ کی سی دلکش دید میں آتی نہیں
گو ستارہ صبح کا بھی آنکھ جھپکانے لگا

کیونکر اُس آئینہ رُو سے میرؔ ملیے بے حجاب
وہ تو اپنے عکس کو بھی دیکھ شرمانے لگا

ضبط کرتے کرتے اب جو اب کو میں نے وا کیا
سو بھی رہتا ہوں یہ کہتا ہائے دل نے کیا کیا

آنکھ پڑتی بھی تھا سے مُنھ پہ جب تک چین تھا
کیا کیا تم نے کہ مجھ بے تاب سے پردا کیا

جسمِ خاکی کا جہاں پردا اُٹھا ہم ہوئے وہ میرؔ سب، وہ ہم ہوا

رہنے کے قابل تو ہرگز بھی نہ یہ عبرت سرا
اتفاقاً اس طرف اپنا بھی آنا ہو گیا

کیا قیامت ہوتی بے پردہ ہوئے کیا جانیے
مصلحت ہی ہوگی ہم سے وہ جو شرماتا رہا
لوگ ہی اس کارواں کے حرف نشنو تھے تمام
راہ چلتے تو جرس ہر گام چلّاتا رہا

میں گلستاں میں آ کے عبث آشیاں کیا
بلبل نے بھی نہ طور گلوں کا بیاں کیا

وفا تھی مہر تھی اخلاص تھا تلطّف تھا
کبھو مزاج میں اُس کے ہمیں تصرّف تھا
جو خوب دیکھو تو ساری وہی حقیقت ہے
چُھپانا چہرے کا عشّاق سے تکلّف تھا

غضب کچھ شور تھا سر میں، بلا بے طاقتی جی میں
قیامت لحظہ لحظہ تھی مرے دل پر جہاں میں تھا
خیالِ چشم و روے یار کا بھی طُرفہ عالم ہے
نظر آیا وہاں اک عالمِ دیگر جہاں میں تھا

گُل بھی ہے محبوب لیکن کب ہے اُس محبوب سا
آگے اُس قد کے ہے سروِ باغ بے اسلوب سا
عشق سے کن نے مرے آگہ کیا اُس شوخ کو
اب مرے آنے سے ہو جاتا ہے وہ محجوب سا
عاقلا نہ حرف زن ہو میرؔ تو کر دے بیاں
زیرِ لب کیا جانیے کہتا ہے کیا مجذوب سا

کبھو وہ توجہ ادھر کر رہے گا
ہمیں عشق ہے تو اثر کر رہے گا

میرؔ کل صحبت میں اُس کی حرف سر کر رہ گیا
پیش جاتے کچھ نہ دیکھی چشم تر کر رہ گیا
سرگزشت اپنی سبب ہے حیرتِ احباب کی
جس سے دل خالی کیا وہ آہ بھر کر رہ گیا

اُس رُخ نے بہت صورتیں لوگوں کی بگاڑیں
اُس قد نے قیامت کا سا ہنگامہ اُٹھایا

تحقیق کروں کس سے حقیقت کے نشے کو
خضر آب اسے کہتا ہے تو آتش کہے موسیٰ

مرید پیرِ مغاں صدق سے نہ ہم ہوتے
جو حق شناس کوئی اور بھی نظر آتا

مستانہ ساتھ میرے روتی پھرے ہے بلبل
گُل سے جو دل لگا ہے ابتر ہے حال اُس کا

زار رکھا، بے حال رکھا، بے تاب رکھا، بیمار رکھا
حال نہ رکھا کچھ بھی ہم میں، عشق نے آخر مار رکھا
عشق بھی ہم میں ہائے تصرف کیسے کیسے کرتا ہے
دل کو چاک، جگر کو زخمی، آنکھوں کو خونبار رکھا

دل رات دن رہے ہے سینے میں عشق ملتا
ہر چند چاہتا ہوں پر جی نہیں سنبھلتا
شب ماہِ چاردہ تھا کس حسن سے نمایاں

ہوتا بڑا تماشا جو یار بھی نکلتا

بوسہ اُس بُت کا لے کے مُنہ موڑا
بھاری پتھر تھا، چوم کر چھوڑا
دل نے کیا کیا نہ رات دُرد دیے
جیسے پکتا رہے کوئی پھوڑا
دل ہی مرغِ چمن کا ٹوٹ گیا
پھول گلچیں نے ہائے کیوں توڑا

ہے عشق میں صبر ناگوارا — پر صبر بن اور کیا ہے چارا
یوں بات کرے ہے میرے خوں سے — گویا نہیں اُن نے مجکو مارا
رُخسار کے پاس وہ دُرِ گوش — ہے پہلوئے ماہ میں ستارا
پھولی مجھے دیکھ کر گلوں میں — بلبل کا ہے باغ میں اجارا

بزمِ عشرت پر جہاں کی گوش وا کر جائے چشم
آج یاں دیکھا گیا جو کچھ کل افسانا ہوا
کیا کہیں حسرت لیے جیسے جہاں سے کوئی جائے

یار کے کوچے سے اپنا اس طرح جانا ہوا

کیا کہے حال کہیں غم زدہ جا کر اپنا
دل نہ اپنا ہے محبت میں نہ دلبر اپنا
اُس گُلِ تر کے کبھو بندِ قبا کھولے تھے
رنگوں گلبرگ کے ناخن ہے معطر اپنا
دل بہت کھینچتی ہے یار کے کوچے کی زمیں
لوہو اس خاک پہ گرنا ہے مقرر اپنا
میرؔ خط بھیجے بر اب رنگ اُڑا جاے ہے
کہ کدھر جاوے کہاں بیٹھے کبوتر اپنا

کیا میرؔ دل شکستہ بھی وحشی مثال تھا
دُنبالہ گردِ چشمِ سیاہِ غزال تھا
سرو اُس طرف کو جیسے گنہگار تھا کھڑا
اودھر جو آ بچہ کے وہ نازک نہال تھا
کیا میرے روزگار کے اہلِ سخن کی بات
ہر ناقص اپنے زعم میں صاحب کمال تھا

کہتے تھے ہم تباہ ہے اب حالِ میرؔ کا
دیکھا نہ تم نے اُس ہیں بھلا کچھ بھی حال تھا

اُن نے کھینچا ہے مرے ہاتھ سے داماں اپنا
کیا کروں گر نہ کروں چاک گریباں اپنا

دلّی عجب شہر تھا خیالوں کا — لوٹا مارا ہے حُسن والوں کا

احوال نہ پوچھو کچھ ہم ظلم رسیدوں کا
کیا حال محبت کے آزار کشیدوں کا
شق ہے دل اپنا تو گلگشتِ گلستاں ہیں
جدول کے کنارے کے نوبادہ دمیدوں کا

ہجر کی راتیں بڑی چھوٹی جو ٹک ہوتیں کہیں
اس میں کچھ نقصان ہوتا تھا مگر ایام کا

اب کیا کریں کہ آیا آنکھوں میں جی ہمارا

افسوس پہلے ہم نے ٹک سوچ کر نہ دیکھا

ہوا ہے عارفانِ شہر کو عرفان بھی اوندھا
کہ ہر درویش ہے مارا ہوا شوقِ الٰہی کا

آنکھوں میں اپنی رات کو خوناب تھا سو تھا
جی دل کے اضطراب سے بیتاب تھا سو تھا

ردیف: ب

مسلم ہیں رفتہ رُوکے کافر ہیں بستہ مُوکے
یہ بیچ سے اُٹھے گا کس طور اختلاف اب

طاقت تعب کی غم میں تمہارے نہیں ہے اب
گویا کہ جان جسم میں سارے نہیں ہے اب
مسکن جہاں تھا دل زدہ مسکیں کا ہم وہاں
کل دیر میر پکارے نہیں ہے اب

بولا جو مُو پریشاں آنکلے میر صاحب
آنا ہوا کہاں سے کہیئے فقیر صاحب
ہر لحظہ اک شرارت ہر دم ہے اک اشارت
اس عمر میں قیامت تم ہو شریر صاحب

حیف اُس سے حال میرا کہتا نہیں ہے کوئی

نالوں سے شب کے میرے رکھتے تو ہیں خبر سب
بجلی سی اک تجلّی آنی تھی آسماں سے
آنکھیں لگا رہے ہیں اہلِ نظر اُدھر سب

تم کس خیال میں ہو تصویر سے جو چپ ہو
کرتے ہیں لوگ کیا کیا تقریر میر صاحب

سب آتشِ سوزندۂ دل سے ہے جگر آب
بے صرفہ کرے صرف نہ کیوں دیدۂ تر آب
پھرتی ہے اُڑی خاک بھی مشتاق کسو کی
سر مار کے کرتا ہے پہاڑوں میں بسر آب
دل میں تو لگی دَوں سی، بھریں چشمے سی آنکھیں
کیا اپنے تئیں روؤں، اِدھر آگ اُدھر آگ
کس شکل سے اک رنگ پہ رہنا ہو جہاں کا
رہتی ہیں کوئی صورتیں یہ نقش ہیں بر آب
اس دشت سے ہو میر ترا کیونکے گزارا
تازانو ترے گل ہے تری تا بہ کمر آب

ردیف:- ت

شعر کے پردے میں مَیں نے غم سُنایا ہے بہت
مرثیے نے دل کے میرے بھی رُلایا ہے بہت

عجب نہیں ہے نہ جانے جو میرؔ چاہ کی ریت
سُنا نہیں ہے مگر یہ کہ "جوگی کس کے میت"
مَستان نمازیوں کو خانہ سازِ دیں جانو
کہ ایک اینٹ کی خاطر یہ ڈھاتے ہیں گے مسیت
غمِ زمانہ سے فارغ ہیں مایہ باختگاں
قمار خانۂ آفاق میں ہے ہار ہی جیت

یاں شہرِ حُسن میں تو کہیں ذکر بھی نہیں
کیا جانیے کہ مہر و فلک ہے کہاں کی بات
اختر شناس کو بھی خلل ہے دماغ کا
پوچھو اگر زمیں ہے، کہے آسماں کی بات

کیا لطف، جو سنو اُسے کہتے پھرا کرو
یوں چاہیے کہ بھولو وہیں، ہو جہاں کی بات

تجھ سے ہزار اُن نے بنا کر دیے بگاڑ
مت جان سادگی سے کہ ہے روزگار دوست
مجھ بے نوا کی یاد رہے میر یہ صدا
اس میکدے میں رہیو بہت ہوشیار دوست

مُنھ لگانا تو درکنار اُن نے — نہ کہا "ہے یہ آشنا صورت"
حلقے آنکھوں میں پڑ گئے، مُنھ زرد — ہو گئی میر تیری کیا صورت

شیخ جنت تجھے، مجھے دیدار — واں بھی ہر اک کی ہے جدا قسمت
کیا ازل میں ملا نہ لوگوں کو — تھی ہماری بھی میر کیا قسمت

زخم جھیلے داغ بھی کھائے بہت — دل لگا کر ہم تو پچھتائے بہت
دیر سے سوئے حرم آیا نہ ٹک — ہم مزاج اپنا ادھر لائے بہت
پھول، گل، شمس و قمر سارے ہی تھے — پر ہمیں اُن میں تمھیں بھائے بہت

وہ جو نکلا صبح، جیسے آفتاب
رشک سے گل پھول مرجھائے بہت

میرؔ سے پوچھا جو میں "عاشق ہو تم"
ہو کے کچھ چپکے سے شرمائے بہت

کوشش اپنی تھی عبث، شاید کی بہت
کیا کریں ہم، چاہا تھا جی ہی بچا

رُک رہا ہے دیر سے تڑپا نہیں
عشق نے کیوں دل کو مہلت دی بہت

دل ہے جدھر کو ادھر اک آگ سی لگی تھی
اُس پہلو ہم جو لیٹے جل جل گئی ہے کروٹ

سخن غم سے آغشتۂ خوں ہے لیکن
نہیں لب مرے آشنائے شکایت
ہمیں عشق میں میرؔ چُپ لگ گئی ہے
نہ شکر و شکایت نہ حرف و حکایت

ردیف: ث

تو پیدا ہے لیکن ہویدا نہیں یہ تصدیع ہموار کی ہے عبث

ردیف: چ

رشکِ خوبی کا اُسی کے جگرِ مہ میں ہے داغ
وہ جو اک خال پڑا ہے ترے رُخسار کے بیچ

مل گیا پھولوں میں اس رنگ سے کرتے ہوئے سیر
کہ تامّل کیے پایا اُسے گلزار کے بیچ

ردیف: ح

ہم جانتے تھے تازہ بنا ہے جہاں کو لیک
یہ منزلِ خراب ہوئی ہے کبھو کی طرح

آخر کو اُس کی راہ میں ہم آپ گُم ہوئے
مُدّت میں پائی یار کی یہ جُستجُو کی طرح

دھوتے ہیں اشکِ خونی سے دست و دہن کو میرؔ
طورِ نماز کیا ہے جو یہ ہے وضو کی طرح

ردیف:- د

زمیں پر مَیں جو پھینکا خط کو کر بند
بہت تڑپا کیا جوں مرغِ پَر بند
کرے ہیں شوقِ گل خوں دل میں ناچار
اسیرانِ شکستہ بال و پَر بند
گئے دن ٹکٹکی کے باندھنے کے
اب آنکھیں رہتی ہیں دو دو پہر بند

نہ دردمندی سے یہ راہ تم چلے، ورنہ
قدم قدم پہ تھی یاں جائے نالہ و فریاد
چمن میں اُٹھتے ہیں سنّاہٹے سے اے بلبل
جگر خراش یہ نالے ہیں تیرے منھ سے زیاد
ثباتِ قصر و در و بام خشت و گل کتنا
عمارتِ دلِ درویش کی رکھو بنیاد
نظر نہ کرنی طرف صید کے دمِ بسمل

یہ ظلمِ تازہ ہوا اُس کشندے سے ایجاد

عشق لوہو پی گیا سب، تن میں ہے سو زرد زرد
پھول میری خاک سے نکلیں گے بھی تو زرد زرد

کارواں در کارواں یاں سے چلے جاتے ہیں لوگ
ہر طرف اس خاکداں میں دیکھتے ہیں گرد گرد

دفترِ اعمال میرا بھول جاویں میرؔ کاش
ہے قیامت اس جریدے کو جو دیکھیں فرد فرد

گزرتی ہے کیا میرؔ دل پر ترے
تو ہوتا ہے ہر لحظہ کچھ زرد زرد

ردیف :- ر

گرمی سے گفتگو کی کرے قیاس جاں پر
شعلہ ہے شمع ساں یاں ہر اک سخن زباں پر
گھر باغ میں بنایا یہ ہم نے یہ نہ جانا
بجلی سے بھی پڑے گا پھول آکے آشیاں پر
تڑپے ہے دل گھڑی بھر تو پہروں غش رہے ہے
کیا جانوں آفت آئی کیا طاقتِ ناتواں پر

پیس مارا دل غموں نے کوٹ کر
کیا اُجاڑا اس نگر کو لوٹ کر

اے مرغِ چمن صبح ہوئی زمزمہ سر کر
دم کھینچ تہِ دل سے کوئی ٹکڑے جگر کو
ہے بے خبری مجھکو ترے دیکھے سے ساقی
ہر لحظہ مری جان مجھے میری خبر کر

جس جاے سراپا میں نظر جاتی ہے اُس کے
آتا ہے مرے جی میں یہیں عمر بسر کر
پڑتے نگہ اُس شوخ کی ہوتا ہے یہ احوال
رہ جاوے ہے جیسے کہ کوئی بجلی سے ڈر کر

تھے جملہ تنِ لطافتِ عالم میں جاں کے ہم تو
مٹی میں اَٹ گئے ہیں اس خاکداں میں آکر
سعی و طلب بہت کی مطلب کے تئیں نہ پہنچے
ناچار اب جہاں سے بیٹھے ہیں ہاتھ اُٹھا کر
ارمان ہے جنھوں کو وے اب کریں محبت
ہم تو ہوئے پشیماں دل کے تئیں لگا کر

پڑتی ہے آنکھ ہر دم جا کر صفاے تن پر
سو جی کیے تھے صدقے اُس شوخ کے بدن پر
کس طرح میرؔ جی کا ہم توبہ کرنا مانیں
کل تک تھے داغ مے کے سب اُن کے پیرہن پر

ق

سحر گوشِ گل میں کہا میں نے جا کر
کھلے بندِ مرغِ چمن سے ملا کر
لگا کہنے فرصت ہے یاں یک تبسم
سو وہ بھی گریبان میں منہ چھپا کر
قیامت رہا مضطراب اُس کے غم میں
جگر پھر گیا رات ہونٹوں پر آ کر

صاف غلطاں خوں میں ہے نخچیرِ یار
لے گیا رنگ اُس کے دل سے تیرِ یار
کوتہی کی میرے طولِ عمر نے
جور میں تو کچھ نہ تھی تقصیرِ یار

مذہب سے میرے کیا تجھے میرا دیار اَور
مَیں اَور یار اَور مرا کاروبار اَور
بندے کو ان فقیروں میں گنیے نہ شہر کے
صاحب نے میرے مجکو دیا اعتبار اَور

اک شور ہے جو عالمِ کون و فساد میں
ہنگامہ ہے اُسی لُگے یہ لعلِ خموش پہ
جو ہے سو مستِ بادۂ وہم و خیال ہے
کس کو ہے یاں نگاہ کسو دُردِ نوش پہ
مرغِ چمن نے کیا حقِ صحبت ادا کیا
لالا کے گل بکھیرے مرے قبر پوش پہ
جب تک بہار رہتی ہے رہتا ہے مست تو
عاشق ہیں میرؔ ہم تو ترے عقل و ہوش پہ

کر باغباں حیا ٹک گل کو نہ ہاتھ میں مَل
دیتی ہے جان بلبل پھولوں کے رنگ و بو پہ
حسرت سے دیکھتے ہیں پروانہ ہمصفیراں
شائستہ بھی ہمارے ایسے ہی تھے کبھو پہ

ردیف ۔ س

گلا مت توڑ اپنا، اے جرس بس
نہیں اس راہ میں فریاد رس بس

کبھو دل کی نہ کہنے پائے اُس سے
جہاں بولے، لگا کہنے کہ بس بس

گل و گلزار سے کیا قیدیوں کو
ہمیں داغِ دل و کنجِ قفس بس

نہ ترساؤ یکایک مار ڈالو
کرو گے کب تلک ہم پر ترس بس

کسو محبوب کی ہو گور پر گل
ہماری خاک کو ہے خار و خس بس

چشم پوشی نہ کر، فقیر ہے میر
مہر کی اُس کو اک نظر ہے بس

امیروں تک رسائی ہو چکی بس
مری بخت آزمائی ہو چکی بس
بہار اب کے بھی جو گزری قفس میں
تو پھر اپنی رہائی ہو چکی بس
لگا ہے حوصلہ بھی کرنے تنگی
غموں کی اب سمائی ہو چکی بس
برابر خاک کے تو کر دکھایا
فلک بس بے ادائی ہو چکی بس
دنی کے پاس کچھ رہتی ہے دولت
ہمارے ہاتھ آئی ، ہو چکی بس
گلے میں گیروی کفنی ہے اب میرؔ
تمھاری میرزائی ہو چکی بس

ردیف ۔ ش

پاؤں پڑتا ہے کہیں، آنکھیں کہیں
اُس کی مستی دیکھ کر جاتا ہے ہوش
کتنے یہ فتنے ہیں موجب شور کے
قد و خد و گیسو و لعلِ خموش

طرح خوش، ناز خوش، اُس کی ادا خوش
خوشا ہم، جو نہ ہوتے ہم کو ناخوش
بتوں کے غم میں نالاں جب نہ تب ہو
نہ راضی خلق تجھ سے نے خدا خوش
جہانِ تنگ رُکنے ہی کی جا تھی
کوئی دن میں تکلف سے رہا خوش

فکر میں مرگ کے ہوں سر بہ پیش
ہے عجب طور کا سفر در پیش

کیا پتنگے کو شمع رُوئے میر
اُس کی شب کو بھی ہے سحر درپیش

ہوں تو دریا، پہ کیا ترکِ خروش
دل کے دل ہی میں کھپائے اپنے جوش

ردیف :- ط

شوق سے بات بڑھ گئی تھی بہت
دفتر اُس کو لکھے ہیں، کیا ہے خط

ردیف:- ظ

جو وہ ہے تو ہے زندگانی میں حظ
مزا عمر کا ہے جوانی میں حظ
نہیں وہ تو سب کچھ یہ بے لطف ہے
نہ کھانے میں لذت نہ پانی میں حظ

ردیف:- ع

یار دُشمن ہو گیا اس کے سبب
ہے متاعِ دوستی بھی کیا متاع

ردیف غ

اب نہیں سینے میں میرے جائے داغ
سوزِ دل سے داغ ہے بالائے داغ

دل جلا آنکھیں جلیں، جی جل گیا
عشق نے کیا کیا ہمیں دکھلائے داغ

منفعل ہیں لالہ و شمع و چراغ
ہم نے بھی کیا عاشقی میں کھائے داغ

صحبت کسو سے رکھنے کا اُس کو نہ تھا دماغ
تھا میر بے دماغ کو بھی کیا ملا دماغ

باتیں کرے ہے پستگیٔ دل کی پر کہاں
کرتا ہے اس دماغ جلے کا وفا دماغ

دو حرف زیرِ لب کہے پھر ہو گیا خموش
یعنی کہ بات کرنے کا کس کو رہا دماغ

ردیف: ف

کیا پیام و سلام ہے موقوف — رسمِ ظاہر تمام ہے موقوف
حیرتِ حسنِ یار سے چپ ہیں — سب سے حرف و کلام ہے موقوف
روز وعدہ ہے ملنے کا لیکن — صبح موقوف، شام ہے موقوف
وے نہیں ہیں کہ داد دے چھوڑیں — اب ترحم یہ کام ہے موقوف

ردیف: ق

کیا حقیقت کہوں کہ کیا ہے عشق　　حق شناسوں کا ہاں خدا ہے عشق
دل لگا ہو تو جی جہاں سے اُٹھا　　موت کا نام پیار کا ہے عشق
اور تدبیر کو نہیں کچھ دخل　　عشق کے درد کی دوا ہے عشق
عشق سے جا نہیں کوئی خالی　　دل سے لے عرش تک بھرا ہے عشق
کون مقصد کو عشق بن پہنچا　　آرزو عشق مدعا ہے عشق
میر مرنا پڑے ہے خوباں پر　　عشق مت کر کہ بد بلا ہے عشق

وصل و جدائی سے ہے مبرا وہ کامِ جاں
معلوم کچھ ہوا نہ ہمیں یاں سوائے شوق
کیا پوچھتے ہو شوق کہاں تک ہے ہم کو میر
مرنا ہی اہلِ درد کا ہے انتہائے شوق

ردیف :- ک

ہر چند صرفِ غم ہیں لے دل جگر سے جاں تک
لیکن کبھو شکایت آئی نہیں زباں تک
کیا کوئی اُس کے رنگوں گُل باغ میں کھلا ہے
شور آج بلبلوں کا جاتا ہے آسماں تک

ردیف :- گ

کام میں ہے ہولے گل کی موج — تیغِ خونریزِ یار کے سے رنگ
برقِ ابرِ بہار نے بھی لیے — اب دلِ بے قرار کے سے رنگ
اس بیاباں میں میرؔ محو ہوے — ناتواں اک غبار کے سے رنگ

ردیف: ل

اب کے ہزار رنگ گلستاں میں آئے گُل
پر اُس بغیر اپنے تو جی کو نہ بھائے گُل

چلیے بغل میں لے کے گلابی کسو طرف
دامانِ دل کو کھینچے ہے ساقی ہوائے گُل

پگڑی میں پھول رکھتے ہیں رعنا جوانِ شہر
داغِ جنوں ہی سر پہ رہا یاں بجائے گُل

بلبل کو کیا سُنے کوئی اُڑ جاتے ہیں حواس
جب دردمند کہتی ہے دَم بھر کے ہائے گُل

سویا نہ وہ بدن کی نزاکت سے ساری رات
بستر پر اُس کے خواب کے کن نے بچھائے گُل

مصروفِ یار چاہیے مرغِ چمن سا ہو
دل نذرِ دیدہ پیشکش و جاں فدائے گُل

چسپاں لباس ہوتے ہیں لیکن نہ اس قدر
ہے چاک رشکِ جامہ سے اس کے قبائے گُل

کیا سمجھے لطف چہروں کے رنگ و بہار کا
بلبل نے اور کچھ نہیں دیکھا سوائے گل
تھا وصف اُن لبوں کا زبانِ قلم پہ میر
یا منھ میں عندلیب کے تھے برگ ہائے گل

نہ ٹک واشد ہوئی جب سے لگا دل	الٰہی غنچہ ہے پژمردہ، یا دل
نہ اُس سے یاں تئیں آیا گیا حیف	رہے ہم جب تلک اُس میں رہا دل
ہمارا خاص مشربِ عشق اُس میں	پیمبر دل ہے، قبلہ دل، خدا دل
سبھوں سے میر بیگانے سے رہتے	جو ہوتا اُس سے کچھ بھی آشنا دل

نہ خوشہ یاں نہ دانہ یاں جلانا گھاس کیا حاصل
ترا ہے برقِ خاطف اس طرف گرنا ہی لاحاصل
سکندر ہو کے مالک سات اقلیموں کا آخر کو
گیا دستِ تہی لے یاں سے، یہ کچھ کر گیا حاصل
بلا قحطِ مروت ہے کہ ہے محصول غلّے پر
کہیں سے چار دانے لاؤ، لیویں جا بجا حاصل
نہ کھینچیں کیونکے نقصاں ہم تو قیدی ہیں تعلّق کے

خودی سے کوئی نکلے تو اُسے ہووے خدا حاصل

پھر امت میرؔ سر اپنا گراں گوشوں کی مجلس میں
سُنے کوئی تو کچھ کہیے بھی، اس کہنے سے کیا حاصل

ردیف :— م

اپنے خیال ہی میں گزرتی ہے اپنی عمر
پرکچھ نہ پوچھو سمجھے نہیں جاتے ہم سے ہم

سرزیر پَر ہیں دیر سے اے ہمصفیر ہم
واقف نہیں ہوائے چمن سے اسیر ہم

دن گزرتا ہے دَم شماری میں — شب کو رہتے ہیں گنتے تارے ہم
میرآؤگے آپ میں بھی کبھو — سخت مشتاق ہیں تمہارے ہم

میرآج وہ بدمَست ہے ہشیار رہو تم
ہے بے خبری اُس کو خبردار رہو تم
جی جائے کسو کا کہ رہے، تم کو قسم ہے
مقدور تلک در پئے آزار رہو تم
وہ محوِ جمال اپنا ہے پروا نہیں اُس کو

خواہاں رہو تم اب کہ طلب گار رہو تم
اس معنی کے ادراک سے حیرت ہی ہے حاصل
آئینہ نمط صورتِ دیوار رہو تم

وعدہ کرو تو سوچ لو مدت کو دل ہیں بھی
یہ حال ہے تو دیر رہیں گے کہاں سے ہم

ہر دم جبیں خراشی، ہر آن سینہ کاوی
حیرانِ عشق تو ہیں پر گرم کار ہیں ہم
حور و قصور و غلماں، نہر و نعیم و جنت
یہ کُلّہم جہنم، مشتاقِ یار ہیں ہم
اب سیل آنسو آتے ہیں چشمِ تر سے
دیوار و دَر سے کہہ دو بے اختیار ہیں ہم
لیتا ہے میرؔ عبرت جو کوئی دیکھتا ہے
کیا یار کی گلی میں بے اعتبار ہیں ہم

ہر ہر سخن یہ اب تو کرتے ہو گفتگو تم

ان بد مزاجیوں کو چھوڑ وگے بھی کبھو تم
یاں آبی آب آکر گُم آپ میں ہوئے ہو

پیدا نہیں کہ کس کی کرتے ہو جُستجو تم
چاہیں تو تم کو چاہیں، دیکھیں تو تم کو دیکھیں

خواہش دلوں کی تم ہو، آنکھوں کی آرزو تم
نسبت تو ہمدگر ہے گو دُور کی ہو نسبت

ہم ہیں نوائے بلبل، ہو گل کی رنگ و بُو تم

ردیف :- ن

ساتھ اپنے نہیں اسبابِ مساعد مطلق
ہم بھی کہنے کے تئیں عالمِ اسباب میں ہیں
غفلتِ دل سے ستم گزرے ہیں سو مت پوچھو
قافلے چلنے کو طیار رہیں ہم خواب میں ہیں

کہے تو ہمنشیں رنگِ تصرف ٹک دکھاؤں میں
الگ بیٹھا خدا بندوں کو آنکھوں میں رچاؤں میں
نگاہِ حسرتِ بُت دَیر سے جانے کی مانع ہے
مزاج اپنا بہت چاہا کہ سوئے کعبہ لاؤں میں

رو چکا خونِ جگر سب، اب جگر میں خوں کہاں
غم سے پانی ہو کے کب کا بہہ گیا، میں ہوں کہاں
دست و دامن، جیب و آغوش اپنے اس قابل نہیں
پھول میں اُس باغِ خوبی سے جو لوں تو لوں کہاں

عاشق و معشوق یاں آخر فسانہ ہو گئے
جائے گریہ ہے جہاں، لیلیٰ کہاں مجنوں کہاں
کھا گیا اندوہ مجکو دوستانِ رفتہ کا
ڈھونڈھتا ہے جی بہت پر اب اُنھیں پاؤں کہاں
سیر کی رنگیں بیاضِ باغ کی ہم نے بہت
سرو کا مصرع کہاں وہ قامتِ موزوں کہاں

عشق نے خوار و ذلیل کیا، ہم سر کو بکھیرے پھرتے ہیں
سوز و دَرْد و داغ و الم سب جی کو گھیرے پھرتے ہیں
بَرسے اگر شمشیر سروں پر منھ موڑیں زنہار نہیں
سیدھے جانے والے اُدھر کے کس سے پھیرے پھرتے ہیں
نقش کسو کا درونِ سینۂ گرمِ طلب، ہے ویسے رنگ
جیسے لیے تصویرِ خیالی پاس چتیرے[۱] پھرتے ہیں

جمع ہوتے نہیں حواس کہیں | جائیں یاں سے جو ہم اُداس کہیں
دل کی دوا اشک سے نہ نکلی بھڑاس | اوسوں بجھنے سُنی ہے پیاس کہیں

---

[۱] مصوّر یا نقاش۔ نیز وہ لوگ جو ظروف مسی وغیرہ صاف کرتے ہیں۔

اس جنوں میں کہیں ہے سر پر خاک
ٹکڑے ہو کر گیا لباس کہیں
عرش تک تو خیال پہنچا میرؔ
وہم پھرتا ہے کہیں، قیاس کہیں

جائیں تو جائیں کہاں، جو گھر رہیں کیا گھر رہیں
یا رب لگتا نہیں جی کاش کہ ہم مر رہیں
بے دماغی، بے قراری، بے کسی، بے طاقتی
کیا جیے وہ جس کے جی کو روگ یہ اکثر رہیں
مضطرب ہوا ایک دو دم تو تدارک بھی ہو کچھ
متصل تڑپے ہے، کب تک ہاتھ یہ دل پر رہیں
زندگی دوبھر ہوئی ہے میرؔ آخر تا کجا
دل جگر جلتے رہیں آنکھیں ہماری تر رہیں

کہاں کے لوگ ہیں خوباں محبت ان کو نہیں
مریں بھی ہم تو نہ دیکھیں، مروت ان کو نہیں
خراب و خوار ہیں سلطان شکستہ حال امیر
کسو فقیر سے شاید کہ صحبت ان کو نہیں

ظلم و ستم کیا، جور و جفا کیا، جو کچھ کیے اُٹھاتا ہوں
خفت کھینچ کے جاتا ہوں، رہتا نہیں دل پھر آتا ہوں

آنے کی میرے فرصت کتنی، دو دَم، دو پل، ایک گھڑی
رنجش کیوں، کاہے کو خشونت، غُصّہ کیا میں جاتا ہوں

پھاڑ کے خط کو گلے میں ڈالا، شہر میں سب تشہیر کیا
سامنے ہوں قاصد کے کیوں کر، اُس سے میں شرماتا ہوں

پہلے فریبِ لطف سے اُس کے کچھ نہ ہوا معلوم مجھے
اب جو چاہ نے بدلیں طرحیں کُڑھتا ہوں، پچھتاتا ہوں

کبھو ملے ہے سو وہ یوں کہ پھر ملا نہ کریں
کرے ہے آپی شکایت کہ ہم گلا نہ کریں

ہمارے حرفِ پریشاں ہی لطف رکھتے ہیں
جنوں ہے بحث جو وحشت میں عاقلا نہ کریں

صفائے دل جو ہوئی ٹک تو دیکھے ہیں کیا کیا
ہم ایسے آئنے کو اپنے کیوں جلا نہ کریں

وہاں میں نہ گرفتار ہوں کہیں مہ و مہر
خدا کرے ترے رُخ سے مقابلا نہ کریں

یہ تصرّف عشق کا ہے سب، وگرنہ ظرف کیا
ایک عالم غم سمایا خاطرِ ناشاد میں

دردیشوں سے تو اُن نے ضدیں نکالیاں ہیں
ایدھر سے ہیں دعائیں، اودھر سے گالیاں ہیں
صبح چمن کا جلوہ ہندی بتوں میں دیکھا
صندل بھری جبیں ہے، ہونٹوں کی لالیاں ہیں
ان گلرخوں کے قامت لہکے ہیں یوں ہوا میں
جس رنگ سے لچکتی پھولوں کی ڈالیاں ہیں
اُس آفتاب بن یاں اندھیر ہو رہا ہے
دن بھی سیاہ اپنے جوں راتیں کالیاں ہیں
چلتے ہیں یہ تو ٹھوکر لگتی ہے میرؔ دل کو
چالیں ہی دلبروں کی سب سے نرالیاں ہیں

رفتگاں میں جہاں کے ہم بھی ہیں
ساتھ اس کارواں کے ہم بھی ہیں
جس چمن زار کا ہے تو گلِ تر

بُلبُل اُس بوستاں کے ہم بھی ہیں
وجہِ بیگانگی نہیں معلوم
تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں
اُس سرے کی ہے پار سائی میرؔ
معتقد اس جواں کے ہم بھی ہیں

نئی گردش ہے اُس کی ہر زماں میں
خلل سا ہے دماغِ آسماں میں
کہا میں دردِ دل یا آگ اُگلی
پھپھولے پڑ گئے میری زباں میں
تری شورش بھی بیکل ہے مگر میرؔ
ملا دی ہے بس کر بجلی فغاں میں

تری پلکیں چُبھتی نظر میں بھی ہیں
یہ کانٹے کھٹکتے جگر میں بھی ہیں
رہے پھرتے دریا میں گرداب سے
وطن میں بھی ہیں ہم سفر میں بھی ہیں

نہ پوچھو نزاکت، لچک ہی نہیں
چھری خنجر اُس کی کمر میں بھی ہیں
جھمک سطحِ رُخ کی سی اُس کی کہاں
صفا و ضیا تو گہر میں بھی ہیں
دل و دلی دونوں ہیں گرچہ خراب
پہ کچھ لطف اس اُجڑے نگر میں بھی ہیں

زبانیں بدلتے ہیں ہر آن خوباں
یہ سب کچھ ہیں بگڑے زمانے کی باتیں
بہت ہرزہ گوئی کی، یاں میر صاحب
کرو کچھ وہاں منہ دکھانے کی باتیں

کچھ نہیں پوچھا ہے مجھ سے جز حدیثِ روئے یار
ہاتھ بلبل کے لگا ہوں باغ میں جب میر میں

کہتے ہیں بہار آئی، گُل پھول نکلتے ہیں
ہم کُنجِ قفس میں ہیں، دل سینوں میں جلتے ہیں

اب ایک ہی بے ہوشی رہتی نہیں ہے ہم کو
کچھ دل بھی سنبھلتے ہیں، پھر دیر سنبھلتے ہیں
کرتے ہیں صفت جب ہم لعلِ لبِ جاناں کی
تب کوئی ہمیں دیکھے کیا لعل اُگلتے ہیں

کچھ تمھیں ملنے سے بیزار ہو میرے، ورنہ
دوستی ننگ نہیں، عیب نہیں، عار نہیں
ناز و انداز و ادا، عشوۂ و اغماض و حیا
آب و گِل میں تری سب کچھ ہے، یہی پیار نہیں

بھرے رہتے ہیں تانے پھول ہی جس کے گریباں میں
وہ کیا جانے کہ ٹکڑے ہیں جگر کے میرے داماں میں
جہاں سے دیکھیے اک شعرِ شور انگیز نکلے ہے
قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میرے دیواں میں
ستم کے تیر اُس کے میرے سینے میں بہت ٹوٹے
کیا جاتا ہے مشکل فرق اب دل اور پیکاں میں

تھا شوق مجھے طالبِ دیدار ہوا میں
سو آئنہ ساں صورتِ دیوار ہوا میں
جب دُور گیا قافلہ تب چشم ہوئی باز
کیا پوچھتے ہو، دیر خبردار ہوا میں
اب پست و بلند ایک ہے جوں نقشِ قدم یاں
پامال ہوا خوب تو ہموار ہوا میں
کب ناز سے شمشیرِ ستم اُن نے نہ کھینچی
کب شوق سے مرنے کو نہ طیار ہوا میں

جلا از بس تمھارے طور سے اے جانِ زیباں ہوں
بھروسا کیا ہے میرا میں چراغِ زیرِ داماں ہوں

عشق وہ خانماں خراب ہے میاں
جس سے دل آگ، چشم آب ہے میاں
تن میں جب تک ہے جاں، تکلف ہے
ہم میں اُس میں ابھی حجاب ہے میاں
لطف و مہر و وفا وہ کیا جانے

نازہے، خشم ہے، عتاب ہے میاں
چشمِ وایاں کی چشمِ بسمل ہے
جاگنا یہ نہیں ہے، خواب ہے میاں
چاہیے وہ کہے سو لکھ رکھیں
ہر سخن میرؔ کا کتاب ہے میاں

گرفتہ دل ہوں سرِ ارتباط مجکو نہیں
کسو سے شہر میں کچھ اختلاط مجکو نہیں
کرے گا کون قیامت کو ریسماں بازی
دل و دماغ گزارِ صراط مجکو نہیں
ہوا ہوں ذرطِ اذیّت سے میں تو سُن اے میرؔ
تمیزِ رنج و خیالِ نشاط مجکو نہیں

کیا کہوں مُنھ تک جگر آتا ہے جب رُکتا ہے دل
جان میری تن میں کیسی کیسی گھبراتی ہے میاں

ہم تو کبھی فصلِ گُل میں چل ٹک تو پاس بیٹھیں

سر جوڑ جوڑ کیسے کلیاں نکلتیاں ہیں

بہار آئی کھلے گُل پھول شاید باغ و صحرا میں
جھلک سی مارتی ہے کچھ سیاہی داغِ سودا میں
سخن دش پانچ یاں ہیں جمع کس حُسن و لطافت سے
تفاوت ہے مرے مجموعہ و عقدِ ثریا میں
کنواں دیکھا نہ کوئی غار میں نے شوق کے مارے
بعینہٖ راہ اندھا سا چلا اُس کی تمنا میں

شہروں میں مُلکوں میں جو میرؔ کہاتا ہے میاں
دیدنی ہے یہ بہت کم نظر آتا ہے میاں
عالم آئینہ ہے جس کا وہ مصوّر بے مثل
ہائے کیا صورتیں پردے میں بناتا ہے میاں
قسمت اُس بزم میں لائی کہ جہاں کا ساقی
دے ہے مَے سب کو ہمیں زہر پلاتا ہے میاں
ہو کے عاشق ترے جان و دل و دیں کھو بیٹھے
جیسا کرتا ہے کوئی ویسا ہی پاتا ہے میاں

حُسن اِک چیز ہے ہو دین کہ تو ہو ناصح
ایسی شئے سے کوئی بھی ہاتھ اُٹھاتا ہے میاں

جائے ہے جی نجات کے غم میں ایسی جنّت گئی جہنّم میں
آپ میں ہم نہیں تو کیا ہے عجب دُور اُس سے رہا ہے کیا ہم میں
بیخودی پر نہ میرؔ کی جاؤ تم نے دیکھا ہے اور عالم میں

جس کا خوباں خیال لیتے ہیں دل کلیجا نکال لیتے ہیں
کیا نظر گاہ ہے کہ شرم سے گل سر گریباں میں ڈال لیتے ہیں
دیکھ اُسے ہو ملک سے بھی لغزش ہم تو دل کو سنبھال لیتے ہیں
ہیں گدا میرؔ بھی ولے دو جہاں کر کے ایک ہی سوال لیتے ہیں

کس کس ادا سے ریختے میں نے کہے ولیک
سمجھا نہ کوئی میری زباں اس دیار میں
تڑپے ہے متّصل وہ کہاں ایسی روز و شب
ہے فرق میرؔ برق و دل بے قرار میں

کیسی وفا و اُلفت کھاتے عبث ہو قسمیں
مُدّت ہوئی اُٹھا دیں تم نے وہ ساری رسمیں
گھبرا کے یوں لگے ہے سینے میں دل تڑپنے
جیسے اسیرِ تازہ بے تاب ہو قفس میں
اب لاغری سے دبے ہیں ساری رگیں دکھائی
پر عشق بھر رہا ہے ایک ایک میری نس میں

مرنا ہے، خاک ہونا، ہو خاک اُڑتے پھرنا
اس راہ میں ابھی تو درپیش مرحلے ہیں
کس دن چمن میں یارب ہوگی صبا گل افشاں
کتنے شکستہ پر ہم دیوار کے تلے ہیں
پست و بلند دیکھیں کیا میرؔ پیش آتے
اس دشت میں ہم اب تو سیلاب سے چلے ہیں

شرر سے اشک ہیں اب چشمِ تر میں
لگی ہے آگ اک میرے جگر میں
نگینِ عاشق و معشوق کے رنگ
خدا رہتے ہیں ہم وے ایک گھر میں
بڑا ہنگامہ تھا کل اُس کے در پہ
قیامت گم ہوئی اس شور و شر میں

بگولے کی روش وحشت زدہ ہم رہے ہے برچیدہ دامن اس سفر میں
رہا تھا دیکھ اودھر میر چلتے عجب اک ناامیدی تھی نظر میں

اثر ہوتا اگر اپنی دعا میں لگ اُٹھتی آگ سب ارض و سما میں
ضعیف و زار تنگی سے ہیں ہرچند ولیکن میر اُڑتے ہیں ہوا میں

چمکنے لگا خون جائے سرشک ابھی دیکھیں آنکھیں ہمیں کیا دکھائیں
خدا ساز تھا آذرِ بُت تراش ہم اپنے تئیں آدمی تو بنائیں
ہمیں سب بے نیازی نے بھلا دیا کہاں اتنی طاقت کہ منت اُٹھائیں
کہیں میر عشقِ مجازی ہے بد حقیقت ہو معلوم گر دل لگائیں

ابکے ماہِ رمضاں دیکھا تھا پیمانے میں
بارے سب روزے تو گزرے مجھے میخانے میں
جیسے بجلی کے چمکنے میں کسو کی سُدھ جائے
بیخودی آئی اچانک ترے آجانے میں
حق جو چاہے تو بندھی مُٹھی چلا جاؤں گا
مصلحت دیکھی نہیں ہاتھ کے پھیلانے میں

میں نالہ کش تھا صبح کو یادِ حبیب میں
سوراخ پڑ گئے جگرِ عندلیب میں
دل خستہ چشم بستہ و رُو زرد تب پہ گرد
حیرت ہے ہم کو میرؔ کے حالِ عجیب میں

یاں جیسے شمعِ بزم، اقامت نہ کر خیال
ہم دل کباب پردے میں سرگرمِ راہ ہیں
کہنا نہ کچھ کبھو، کھڑے حسرت سے دیکھنا
ہم کُشتنی ہیں واقعی، گو بے گناہ ہیں
کہ مہرباں ہوں دُور سے کہ آنکھیں پھیر لیں
معشوق آفتاب ہیں، عشّاق ماہ ہیں

مجکو دماغِ وصفِ گل و یاسمن نہیں
میں جوں نسیم بادفروشِ چمن نہیں
پہنچا نہ ہوگا منزلِ مقصود کے تئیں
خاکِ رہ اُس کی جس کا عبیرِ کفن نہیں
ہم کو خرام ناز سے مرت خاک میں ملا

دل سے ہے جن کو راہ یہ اُن کا چلن نہیں

کل جا کے ہم نے میرؔ کے ہاں یہ سُنا جواب
مُدت ہوئی کہ یاں تو وہ غربت وطن نہیں

روز اک ظلم نیا کرتے ہیں یہ دلبر، اور
روز کہتے ہیں ستم ترک ہم اب کرتے ہیں

وہ آپ چل کے آوے تو شاید کہ جی رہے
ہوتی نہیں تسلیٔ دل اب خبر سے یاں

مصرع کوئی کوئی کبھو موزوں کروں ہوں میں
کس خوش سلیقگی سے جگر خوں کروں ہوں میں

بات اپنے ڈھب کی کوئی کرے وہ تو کچھ کہوں
بیٹھا خموش سامنے ہوں ہوں کروں ہوں میں

تا چند وہ ستم کرے ہم در گزر کریں
اب جی میں ہے کہ شہر سے اُس کے سفر کریں
کب تک ہم انتظار رہیں ہر لحظہ بے

گھر سے نکل نکل کے گلی میں نظر کریں
لادیں کہاں سے خونِ دل اتنا کہ میرؔ ہم
جس وقت بات کرنے لگیں چشم تر کریں

ردیف :۔ و

قتل کیے پر غصہ کیا ہے' لاش مری اُٹھوانے دو
جان سے ہم بھی جاتے رہے ہیں' آؤ تم بھی جانے دو

جان سلامت لے کر جاوے کعبے کو تو سلام کریں
ایک جراحت اُن ہاتھوں کا صیدِ حرم کو کھانے دو

اب کے بہت ہے شورِ بہاراں' ہم کو مت زنجیر کرو
دل کی ہوس کچھ ہم بھی نکالیں' دھومیں ہم کو مچانے دو

کرتے ہو تم نیچی نظریں' یہ بھی کوئی مروت ہے
برسوں سے پھرتے ہیں جُدا ہم' آنکھ سے آنکھ ملانے دو

کیا جاتا ہے اس میں ہمارا' چپکے ہم تو بیٹھے ہیں
دل جو سمجھنا تھا سو سمجھا' ناصح کو سمجھانے دو

ضعف بہت ہے میرؔ تمہیں' ٹک اُس کی گلی میں مت جاؤ
صبر کرو کچھ اور بھی صاحب' طاقت جی میں آنے دو

دوست رکھتا ہوں بہت اپنے دلِ بیمار کو

خوں کیا ہے مدّتوں اس میں غمِ بسیار کو
جب کبھو ادھر سے نکلے ہے تو اک حسرت کے ساتھ
دیکھے ہے خورشید اُس کے سایۂ دیوار کو
خونچکاں شکوے ہیں دل سے تا زباں میری، مگر
سی لیا ہے، تو کہے، میں نے لبِ اظہار کو
عاشقی وہ روگ ہے جس میں کہ ہو جاتی ہے یاس
اچھے ہوتے کم سُنا ہے میرؔ اس آزار کو

تم بِن چمن کے گل نہیں چڑھتے نظر کبھو
یہ کیا روش ہے، آؤ چلے ٹک ادھر کبھو
دریا سی آنکھیں بہتی ہی رہتی تھیں سو کہاں
ہوتی ہے کوئی کوئی پلک اب تو تر کبھو
غم کو تمھارے دل کے نہایت نہیں ہے میرؔ
اس قصّے کو کروگے بھی تم مختصر کبھو

یہ سرا سونے کی جاگہ نہیں، بیدار رہو
ہم نے کر دی ہے خبر تم کو خبردار رہو

لاگ اگر دل کو نہیں، لطف نہیں جینے کا
اُلجھے سُلجھے کسی کاکل کے گرفتار رہو

گرچہ وہ گوہرِ تر ہاتھ نہیں لگتا، لیک
دَم میں دَم جب تئیں ہے اُس کے طلبگار رہو

سارے بازارِ جہاں کا ہے یہی مول اے میرؔ
جان کو بیچ کے بھی دل کے خریدار رہو

کرنا شعار خوب ہے عجز و نیاز کو
بے وقر جانتے ہیں دل بے گداز کو

جوں شمع سر کٹے ہے بیاں حال کا کیے
لا ناز ہاں یہ خوب نہیں دل کے راز کو

صوفی کی پارسائی کی ہے خانقہ میں دھوم
لے چلیے گا کبھو اُدھر اُس مستِ ناز کو

دل ایک تڑپنے میں پرے عشق کے پایا
اس طائرِ بے بال کی پرواز تو دیکھو

سب میرؔ کو دیتے ہیں جگہ آنکھوں پر اپنی

اس خاکِ رہِ عشق کا اعزاز تو دیکھو

آرسی اُس کے سامنے دھرلو — کب ہے ویسی مواجہ کر لو
اُس کی تیغِ ستم بلند ہوئی — جی ہے مرنے کو تو چلو مر لو
کیا بلا خیز جا ہے کوچۂ عشق — تم بھی یاں میر مول اک گھر لو

کھینچنا رنج و تعب کا دوستاں عادت کرو
تب کسی نا آشنائے مہر سے اُلفت کرو
پہلے دیوانے ہوے پھر میر آخر ہو گئے
ہم نہ کہتے تھے کہ صاحب عاشقی تم مت کرو

بہرِ فردوس ہو آدم کو الم کاہے کو
وقفِ اولاد ہے وہ باغ تو غم کاہے کو
یہ بھی اک ڈھب ہے نہ ایذا نہ کسی کو راحت
رحم موقوف کیا ہے تو ستم کاہے کو
چشم پوشی کا مری جان تمھیں لپکا ہے
کھاتے ہو دیدہ درائی سے قسم کاہے کو

دل کو کہتے ہیں کہ اُس گنجِ رواں کا گھر ہے
اس خرابے میں کرے ہے وہ کرم کاہے کو
شور نے نامِ خدا اُن کے بلا سر کھینچا
میرؔ سا ہے کوئی عالم میں علم کاہے کو

بارے دُنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو
ہم کو دیوانگی شہروں ہی میں خوش آتی ہے
دشت میں قیس رہو، کوہ میں فرہاد رہو
میرؔ بل بل کے بہت خوش ہوئے تم سے پیارے
اس خرابے میں مری جان تم آباد رہو

نرمی مخالفوں سے، سختی موافقوں سے
واں موم سے بنے ہو یاں لوہے سے کڑے ہو
ہوتے ہیں خاک رہ بھی لیکن نہ میرؔ ایسے
رستے میں آدھے دھڑ تک مٹی میں تم گڑے ہو

مزامیر

کیا آنکھ بند کرکے مراقب ہوئے ہو تم
جاتے ہیں کیسے کیسے ہیے چشم وا کرو
موقوف ہرزہ گردی نہیں کچھ قلندری
زنجیرِ سر اُتار کے زنجیرِ پا کرو
ہر چند اس متاع کی اب قدر کچھ نہیں
پر جس کسو کے ساتھ رہو تم وفا کرو
تدبیر کو مزاجِ محبت میں دخل کیا
جاں کاہ اس مرض کی نہ کوئی دوا کرو

کب میسر اُس کے مُنہ کا دیکھنا آتا ہے میر
پُھول گُل سے اپنے دل کو تم بھی بہلایا کرو

کہتا ہے کون میر کہ بے اختیار رو
ایسا تو رو کہ رونے پہ تیرے ہنسی نہ ہو
پایا گیا وہ گوہرِ نایاب سہل کب
نکلا ہے اُس کو ڈھونڈھنے تو پہلے جان کھو
سُنتے نہیں جو کہیئے، نہ کہیئے تو دم رُکے

کچھ پوچھیے نہ قصّہ ہمارا ہے گو مگو
ا

جہاں دیکھو کہا کرتے ہیں اُس کے عشق کے غم میں
ہم دو چار بیٹھے دل شکستہ اپنے حالوں کو
نہ چشمِ کم سے مجھ درویش کی آوارگی دیکھو
تبرک کرتے ہیں کانٹے میرے پاؤں کے چھالوں کو
کرے ہے جب یہ بلبل غش سو یہ اُس جنس کی قیمت
نہیں افسوس آنکھیں بے حقیقت پھول والوں کو

حاصل کوئی اُمید ہوئی ہو تو میں کہوں
خوں ہی ہوا کیے ہیں مرے دل میں سارے چاؤ
آ عاشقوں کی آنکھوں میں ٹک اے بدل رقیب
ان منظروں سے بھی ہے بہت دُور تک دکھاؤ
صحبت جو اُس سے رہتی ہے کیا نقل کیجیے ہائے
جب آگئے ہیں ہم تو کہا اُن نے یاں سے جاؤ

دل کھیے میں ہو تو کاہے کو کوئی بیتاب ہو

آنکھ کا لگنا نہ ہو تو اشک کیوں خوناب ہو
لُطف سے اے ابرِ رحمت ایک دو بارش ادھر
کِشتِ نذرِ ناامیداں بھی تو ٹک سیراب ہو

ردیف :- ہ

رکھ منہ کو گُل کے منہ پہ کیا غُنچہ ہو کے سوئی
ہے شُوخ چشم شبنم اس کو ادب نہیں کچھ
یہ حال بے سبب تو ہوتا نہیں ہے، لیکن
رونے کا لمحہ ظاہر سبب نہیں کچھ

رستے سے چاکِ دل کے ہوا آگاہ
یار تک پھر تو کس قدر ہے راہ
آنکھ اُس منہ پہ کس طرح کھولوں
جوں پلک جل رہی ہے میری نگاہ
ہیں مسلمان ان بتوں سے ہمیں
عشق ہے لا الٰہ الا اللہ

ہے تمنائے وصال اُس کی مری جان کے ساتھ
جان ہی جائے گی آخر کو اس ارمان کے ساتھ
کیا فقط توڑ کے چھاتی ہی گیا تیر اُس کا
لے گیا صاف مرے دل کو بھی پیکان کے ساتھ
بحر پہ تھر پہ برستے ہے برابر ہی ابر

پیش ہر اک سے کریم آتے ہیں احسان کے ساتھ
تیر اُس کا جو گزر دل سے چلا، جی بھی چلا
رسمِ تعظیم سے ہو لیتے ہیں مہمان کے ساتھ
آدمیت سے تمھیں میسّر ہو کیونکر بہرہ
تم نے صحبت نہیں رکھی کسو انسان کے ساتھ

کیا مرے طولِ پریشانی کی حیرت ہمنفس
آنکھیں تو دی ہیں خدا نے اُس کے لمبے بال دیکھ
دامنِ صحرا میں کیا وسعت ہے جو دل میں نہیں
مُوند کر آنکھیں گریباں میں بھی ٹک سر ڈال دیکھ

آنکھیں جو ہوں تو عین ہے مقصود ہر جگہ
بالذات ہے جہاں میں وہ موجود ہر جگہ
واقف ہو شانِ بندگی سے قیدِ قبلہ کیا
سر ہر کہیں جُھکا کہ ہے مسجود ہر جگہ
ہیں دِلّی لکھنؤ کے خوش اندام خوب، لیک
راہِ وفا و مہر ہے مسدود ہر جگہ

پھرتی ہے اپنے ساتھ لگی متصل فنا
آبِ رواں سے ہم ہوئے نابود ہر جگہ
سودائے عاشقی میں توجہ کا زیان ہے
پھرتے ہیں میر ڈھونڈھتے ہی سود ہر جگہ

اب خوشامد اُنھیں کی آٹھ پہر کرتے ہیں
گفتگو میر کو جن لوگوں سے تھی عار کے ساتھ

نہ باتیں کرو سرگرانی کے ساتھ — مری زیست ہے مہربانی کے ساتھ
کہے میں نے اشعار ہر بحر میں — ولیکن قیامت روانی کے ساتھ
بکھرے ہے جوں لختِ دل آہ صبح — ہوا کب ہے اس گلفشانی کے ساتھ

اثر ہوتا تو کب کا ہو بھی چکتا — دعائے صُبح سے اب ہاتھ اُٹھا بیٹھ

کیا کریں نیچی نظر کرنے سے غصّہ کھائے وہ
اور مجلس میں جو رہیے دیکھ، تو شرمائے وہ

ردیف ۔ ی

بے پردہ نہ ہونا تھا اسرارِ محبت کو
عاشق کُشتی ہے، جب سے ہے عشق کی رُسوائی
کیا عہدہ برآئی ہو اُس گُل کی دورنگی سے
ہر لحظہ ہے خودرائی ہر آن ہے رعنائی

لطف کہاں وہ بات کیے پر پھول سے جھڑنے لگ جاویں
سُرخ کلی بھی گُل کی اگرچہ یار کے لعلِ لب سی ہے
خانہ خراب ہو خواہشِ دل کا، آہ نہایت اس کو نہیں
جان لبوں پر آتی ہے، تو بھی گرمِ طلب سی ہے

اک گردن سے سوچ باندھے کیا کیا کریے ہوں جو دا
مُدّت اُس پہ ایک نفس، جوں صبح، ہماری فرصت کی

قدرِ کُفر اسلام سے زائد جانی سُبحہ فروشی سے

بکتے کہیں بازار میں تونے گہ زنّار کو دیکھا ہے؟

کچھ جز ملال ہو تو خریدار ہو کوئی
دُنیا کی قدر کیا کہ متاعِ قلیل ہے

برسوں گزرے ہیں ملے، کب تئیں یوں پیار ہے
دُور سے دیکھ لیا اُس کو تو جی مار رہے
مرگ کے حال جُدائی میں جئیں یوں کب تک
جاں بے تاب رہے، دل کو اک آزار ہے

ہم طائرِ بے پر ہیں وے جن کو بہاراں میں
گلگشتِ گلستاں کا شوق اور اسیری ہے

سوزِ درونِ دل نے آخر جی ہی کھپا دیا ہے
ٹھنڈا دل اب ہے ایسا جیسے بجھا دیا ہے
اب نیند کیونکے آوے گرمی نے عاشقی کی
دل ہے جدھر وہ پہلوُ سارا جلا دیا ہے

حرفِ غلط تھے کیا ہم صفحے پہ زندگی کے
جو صاف یوں قضا نے ہم کو مٹا دیا ہے
کڑھتے ہمیشہ رہنا ہم کو بغیر اُس کے
کیا روگ دوستی نے جی کو لگا دیا ہے

ہم چمن میں گئے تھے وانہ ہوئے
نکہتِ گُل سے آشنا نہ ہوئے
سر کسو سے فرو نہیں آتا
حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے
کیا کیا قفس سے سر مارا
موسمِ گل میں ہم رہا نہ ہوئے

اس عرصے سے گیا ہو کہیں کوئی تو کہیں
جل بھر کے لوگ یاں کے یہیں سارے رہ گئے
تسبیحیں ٹوٹیں، خرقے مصلے پھٹے جلے
کیا جانے خانقاہ میں کیا میر کہہ گئے

رنگ لیتی ہے سب ہوا اُس کا
اُس سے باغ و بہار ہیں رستے
اک نگہ کر کے اُن نے مول لیا
بک گئے آہ ہم بھی کیا سستے
میر جنگل پڑے ہیں آج جہاں
لوگ کیا کیا نہیں تھے کل بستے

غزل در بحرِ رباعی

سب شرمِ جبینِ یار سے پانی ہے — ہر چند کہ گل شگفتہ پیشانی ہے
جوں آئینہ سامنے کھڑا ہوں یعنی — خوبی سے ترے چہرے کی حیرانی ہے
کل سیل سا جوشاں جو ادھر آیا میر — سب بولے کہ یہ فقیر سیلانی ہے

جی کے لگنے کی میر کچھ کہہ بھی — ہے وہی بات جس میں ہو تہہ بھی

بہت رونے ہمارے دیدۂ تر آب نہیں کھلتے
متاعِ آب دیدہ ہے کوئی اس کو ہوا دیوے

اپنا اپنا ہے ذائقہ، ہم کو — بوسۂ کُنجِ لب ہی بھاتا ہے
آتشِ عشق جس کے دل کو لگی — شمع ساں آپ ہی کو کھاتا ہے
میری تو ہے پلک سے چھوٹی نگاہ — اور وہ اُس پہ مُنہ چھپاتا ہے
میر صنّاع ہے ملو اُس سے — دیکھو تو باتیں کیا بناتا ہے

شائستۂ غم وستمِ یار ہم ہوئے
عاشق کہاں ہوئے کہ گنہگار ہم ہوئے

پامال یوں کیا کہ برابر ہیں خاک کے
کیا ظلم ہو گیا کہ طلب گار ہم ہوے

تعارف کیا رہا اہلِ چمن سے　　ہوئی اک عمر میں اپنی رہائی
کہیں سو کیا کہیں سر پہ ہمارے　　قیامت شامتِ اعمال لائی

ان دو ہی صورتوں میں شکل اب نباہ کی ہے
یا صبر ہم کو آوے، یا رحم اُس کو آوے
کچھ زخم کھل چکے ہیں، کچھ داغ کھل رہے ہیں
ایکے بہار دیکھیں کیا کیا شگوفے لاوے
ہم جس زمیں پہ آئے واں آسماں یہی تھا
یارب جو کوئی جاوے تو کس طرف کو جاوے

بہار آئی نکالو مت مجھے اب کے گلستاں سے
مرا دامن بنے تو باندھ دو گل کے گریباں سے
خدا جانے کہ دل کس خانہ آباداں کو دے بیٹھے
کھڑے تھے میر صاحب گھر کے دروازے پہ حیراں سے

برسوں تک جی کو مار مار رہے رات دن ہم امید وار رہے
اُس کی آنکھوں کی مستی ہے عاشق چاہیے یوں کہ ہوشیار رہے

جانبِ مسجد تھی وہ کافر نگاہ شیخ صاحب دین و ایماں سے گئے

دو دیدۂ تر اپنے جو یار کو ہیں تکتے
ایک ایک کو نہیں پھر غیرت سے دیکھ سکتے
ہوتا تھا گاہ گاہے محسوس درد آگے
اب دل جگر ہمارے پھوڑے سے ہیں لپکتے
شعلوں کی ڈاک گویا لعلوں تلے دھری ہے
چہروں کے رنگ ہم نے دیکھے ہیں کیا جھمکتے
جا لگ سے لے گئے ہیں نازاں جب آ گئے ہیں
نو بادگانِ خوبی جوں شاخِ گل لچکتے
اس حسن سے کہاں ہے غلطانی موتیوں کی
جس خوب صورتی سے میر اشک ہیں ڈھلکتے

صندلِ دردِ سرِ مہر و وفا عاقبت دیکھا تو خاک گور ہے

گرچہ جی کب چاہتا ہے آپ کا آنے کو یاں
پر کبھو تو آئیے، خاطر ہماری کیجیے

کرتی پھری ہے رُسوا سارے چمن میں مجکو
گر کوئی بات دل کی بلبل سے میں کہی ہے
درویش جب ہوئے ہم تب ہے ہمیں برابر
کشکولِ دائرگوں ہے یا افسرِ شہی ہے

آئینہ دار اُسی سے بنتے ہیں شش جہت کو
دیکھیں تو مُنھ دکھاوے وہ کامِ جاں کدھر سے
مت رنج کھینچ ٹل کر ہُشیار مرتہاں سے
اُس کی خبر ملے گی اک آدھ بے خبر سے

غربت یہ مہرباں ہوے میری، سو یہ کہا
ان کو غریب کوئی نہ سمجھے، غضب ہیں وے

خوش طرح مکاں دل کا ڈھلنے میں شتابی کی

اس عشق و محبت نے کیا خانہ خرابی کی
سِکتا ہے دل ایدھر کو بھُنتا ہے جگر اودھر
چھاتی ہوئی ہے میری دُکان کبابی کی
وہ نرگسِ مستانہ باتیں کرے ہے درہم
تم دیکھو، نہ کچھ بولو، کیا بات شرابی کی
بے سُدھ ہوئے ہم آئی اک بُو جو گلستاں سے
پُر زور تھی مَے کتنی غنچے کی گلابی کی

دُور سے ٹک ملتفت ہوتے رہو جب تلک دُوری سے کوئی خو کرے
لوہو پانی ایک کر دیتا ہے عشق پانی کر دے چشم، دل لوہو کرے

حدیثِ زُلفِ دراز اُن کے مُنھ کی بات بڑی
کبھو کے دن ہیں بڑے یاں کبھو کی رات بڑی

تجکو اے مرغِ چمن غیرت بھی ہے وا نسیمِ صبح سے ہوتا ہے گُل
اُس کے دَر سے جانے کی حسرت بھی ہے جی ہی دینے کا نہیں کُڑھنا فقط

چلے ہم اگر تم کو اکراہ ہے
فقیروں کی اللہ اللہ ہے
چراغانِ گُل سے ہے کیا روشنی
گلستاں کسو کی قدم گاہ ہے

یار کا جور و ستم کام ہی کر جاتا ہے
کتنا جی عاشقِ بے تاب کا مَر جاتا ہے
جیسے گرداب ہے گردش مری ہر چار طرف
شوق کیا جانئے یہ مجکو کدھر جاتا ہے
جوششِ اشک میں ٹک ٹھہرے رہو پیشِ نظر
اب کوئی پَل میں یہ سیلاب اُتر جاتا ہے
زَرد و رُخسار یہ کیوں اشک نہ آوے گلرنگ
آگے سے آنکھوں کے وہ باغِ نظر جاتا ہے
واعظِ شہر تنک آب ہے مانندِ حباب
ٹک ہوا لگتی ہے اس کو تو اُبھر جاتا ہے

کی عمر صرف ساری پر گُم ہے مطلب اپنا
منزل نہ پہنچے ہم تو طَے کر کے راہ کو بھی
خواہش بہت جو ہو تو کاہش ہے جان و دل کی

کچھ کم کر ان دنوں میں اے میرؔ چاہ کو بھی

کچھ میں بھی عجب جنس ہوں بازارِ جہاں میں
سو ناز مجھے لیتے خریدار کرے ہے
زنہار نہ جا پرورشِ دورِ جہاں پر
مرنے کے لیے لوگوں کو طیار کرے ہے
تصویر سے دروازے پہ ہم اُس کے کھڑے ہیں
انسان کو حیرانی بھی دیوار کرے ہے

بزم میں پوچھا تو یوں انجان ہو میرؔ ان لوگوں میں کس کا نام ہے

یاں تو تکلیف سی کھنچی تکلیف واں وہی اب تلک تکلّف ہے
مرگ کیا منزلِ مراد ہے میرؔ یہ بھی اک راہ کا توقّف ہے

تسکین دردمندوں کو یارب شتاب دے
دل کو ہمارے چین دے آنکھوں کو خواب دے
اُس کا غضب سے نامہ نہ لکھنا تو سہل ہے

لوگوں کے پوچھنے کا کوئی کیا جواب دے
مژگانِ تر کو یار کے چہرے پہ کھول میر
اس آبِ خستہ سبزے کو ٹک آفتاب دے

جہاں شطرنج، بازندہ فلک، ہم تم ہیں سب مہرے
بسانِ شاطرِ نو ذوق اسے مہروں کی زدنے ہے

برنگِ طائرِ نوپر ہوئے آوارہ ہم اُٹھ کر
کہ پھر پائی نہ ہم نے راہ اپنے آشیانے کی
اگر طالع کرے یاری تو مرتے کربلا جا کر
عبیر اپنے کفن کی، خاک ہو اُس آستانے کی

مہِ یک ہفتہ دل کش اس قدر کا ہے کو ہوتا ہے
کروں ہوں شکر کے سجدے کہ میں نے وہ جبیں دیکھی
نظر اُس کی حیا سے تیرِ پشتِ پا پر اکثر ہے
کنھوں نے کا ہے کو اُس کی سی چشمِ شرمگیں دیکھی

نامہ مرے عمل کا بھی اسے کاش ساتھ جائے
جب آسمان لپٹیں گے کاغذ کے تاؤ سے

تا چند یہ خمیازہ کشی، تنگ ہوں یا رب
آغوش مری ایک شب اُس شوخ سے بھر جائے
جاتا ہے جدھر، منزلِ مقصود نہیں وہ
آوارہ جو ہو عشق کا بے چارہ کدھر جائے

بُتوں کے جُرمِ اُلفت پر ہمیں زجر و ملامت ہے
مسلماں بھی خدا لگتی نہیں کہتے قیامت ہے
جُھکی ہے شاخِ پُر گُل ناز سے کیا صحنِ گلشن میں
نہالِ قد کی اُس کے مدعی تھی، سو ندامت ہے

خدا کرے مرے دل کو ٹک اک قرار آوے
کہ زندگی تو کروں، جب تلک کہ یار آوے
تمھارے جوروں سے اب جاں جائے عبرت ہے
کسو سے کہیئے تو اُس کو نہ اعتبار آوے

نہیں ہے چاہ بھلی اتنی بھی دعا کر میؔر
کہ اب جو دیکھوں اُسے میں بہت نہ پیار آوے

دل سوختہ ہوں مجکو تکلیفِ حرف مت کر
اک آگ کی لپٹ سی نکلے ہے ہر سخن سے

کعبے کے دَر پہ تھے ہم یا دَیر میں دَر آئے
آوارگی تو دیکھو کیدھر سے کیدھر آئے

قصر و مکان و منزل ایکوں کو سب جگہ ہے
ایکوں کو جا نہیں ہے، دُنیا عجب جگہ ہے
اُس کے بدن میں ہر جا دلکش ہے یوں، و لیکن
یا سطحِ رُخ جگہ ہے، یا کُنجِ لب جگہ ہے

دل کی بیماری سے طاقت طاق ہے
زندگانی اب تو کرنا شاق ہے
مت پڑا رہ دَیر کے ٹکڑوں پہ میرؔ
اُٹھ کے کعبے چل، خدا رزّاق ہے

غزل مسلسل

بات کیا آدمی کی بن آئی ۔۔۔ آسماں سے زمین نپوائی
چرخ زن اُس کے واسطے ہے مدام ۔۔۔ ہو گیا دن تمام رات آئی
ماہ و خورشید و ابر و باد سبھی ۔۔۔ اُس کی خاطر ہوئے ہیں سودائی
کیسے کیسے کیے تردّد جب ۔۔۔ رنگ رنگ اُس کو چیز پہنچائی
اُس کو ترجیح سب کے اوپر دے ۔۔۔ لطفِ حق نے کی عزّت افزائی
حیرت آتی ہے اُس کی باتیں دیکھ ۔۔۔ خود سری، خودستائی، خود رائی
شکر کے سجدوں میں یہ واجب تھا ۔۔۔ یہ بھی کرتا سدا جبیں سائی
سو تو اُس کی طبیعتِ سرکش ۔۔۔ سر نہ لائی فرو، کہ ٹک لائی

میرؔ ناچیز مشتِ خاک، اللہ
اُن نے یہ کبریا کہاں پائی

خانوادے ہو گئے کیا کیا خراب ۔۔۔ خانہ سازِ دین کیسے مر گئے
دستِ افشانئ بلائے کو یاں شوق ہیں ۔۔۔ صومعہ سے میرؔ بھی باہر گئے

دیوانِ چہارم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیوانِ چہارم

کرتا ہوں اللہ اللہ درویش ہوں سدا کا
سرمایۂ توکل یاں نام ہے خُدا کا
یارب ہماری جانب یہ ننگ کیوں ہے عائد
جی ہی سے مارتے ہیں جو نام لے وفا کا
کیا فقر میں گزر ہو چشمِ طمع سے بن
ہے راہ تنگ ایسی جیسے سوئی کا ناکا
اَبر، اَور جوشِ گل ہے چل خانقہ سے صوفی
ہے لطف میکدے میں دہ چند اس ہوا کا
آلودہ خوں سے ناخن ہیں شیر کے سے ہر سو
جنگل میں چل بنے تو، پھولا ہے زرد ڈھاکا
یہ دو ہی صورتیں ہیں یا منعکس ہے عالم
یا عالم آئنہ ہے اُس یارِ خود نما کا

کیا میں ہی جاں بلب ہوں بیماریٔ دلی سے
مارا ہوا ہے عالم اس دردِ بے دوا کا

گُل پھُول فصلِ گل میں صد رنگ ہیں شگفتہ
میں دل زدہ ہوں ابکی رنگینیٔ ہوا کا

کیونکر بسر کرے غم و غُصّے میں ہجر کے
خوگر جو ہو کسو کے کوئی التفات کا
ڈرتا ہوں مالکانِ جزا ایچھاتی دیکھ کر
کہنے لگیں نہ، واہ رے زخم اُس کے ہات کا
واعظ کہے سو سچ ہے وے مَے فرش سے
ہم ذکر بھی سُنا نہیں صوم و صلوٰت کا
عالم کسو حکیم کا باندھا طلسم ہے
کچھ ہو تو اعتبار بھی ہو کائنات کا

تجاہل تغافل تساہل کیا ہوا کام مشکل، توکل کیا
نہیں تاب لاتا دلِ زار اب بہت ہم نے صبر و تحمل کیا

جنوں تھا جو مجکو نہ چُپ رہ سکا کہ زنجیر ٹوٹی تو میں غل کیا
حقیقت نہ میرؔ اپنی سمجھی گئی شب و روز ہم نے تامّل کیا

رفتۂ عشق کیا ہوں میں اب کا جا چکا ہوں جہان سے کب کا
لوگ جب ذکرِ یار کرتے ہیں دیکھ رہتا ہوں میں منہ سب کا
مست رہتا ہوں جب سے ہوش آیا میں بھی عاشق ہوں اپنے مشرب کا
زُلف سا پیچ دار ہے ہر شعر ہے سخن میرؔ کا عجب ڈھب کا

کیا یاری کر دُور پھرا وہ کیا کیا اُن نے فریب کیے
جس کے لیے آوارہ پھرے ہم چھوٹا شہر و دیار اپنا
بات کہے تلوار نکالے، آنکھ لڑائے جی مارے
کیونکے جتاوے اُس سے کوئی چاہ محبت پیار اپنا
رحم کیا کر، لطف کیا کر، پوچھ لیا کر، آخر ہے
میرؔ اپنا، غمخوار اپنا، پھر زار اپنا، بیمار اپنا

کیا نُور کا بُکّہ ہے چہرے کو شب مہ میں
مُنہ کھولے جو سوتا، پہتا بچھپایا جاتا

کیا شوق کی باتوں کی تحریر ہوئی مشکل
تھے جمع قلم کاغذ پر کچھ نہ لکھا جاتا
تھا عیسیٰ بھی دیوانہ پر ساتھ ظرافت کے
ہم سلسلہ داروں کی زنجیر ہلا جاتا

یہ دل نے کیا کیا کہ اسیرِ بلا کیا
اُس زُلفِ پُرشکن کا مجھے مبتلا کیا
گو بے کسی سے عشق کی آتش میں جل بجھا
میں جوں چراغِ گور اکیلا جلا کیا
آیا نہ اُس طرف سے جواب ایک حرف کا
ہر روز خطِ شوق ادھر سے چلا کیا

سرگرمِ طلب ہو کر کھو یا گیا میں آپی
کیا جانیے پاؤں گا یا اُس کو نہ پاؤں گا

گردن کشی سے اپنی مارے گئے ہم آخر
عاشق اگر ہوئے تھے ناز و غرور کیا تھا

غم قرب و بُعد کا تھا جب تک نہ ہم نے جانا
اب مرتبہ جو سمجھے وہ اتنا دُور کیا تھا
اے وائے یہ نہ سمجھے مارے پڑینگے اس میں
اظہارِ عشق کرنا ہم کو ضرور کیا تھا
مرتا تھا جس کی خاطر اُس کی طرف نہ دیکھا
میرِ ستم رسیدہ ظالم غیور کیا تھا

دل کو گل کہتے تھے درد و غم سے مُرجھا گیا
جی کو مہماں سُنتے تھے مہمان سا آیا گیا
جیسے پرچھائیں دکھائی دیکے ہو جاتی ہے محو
میرؔ بھی اُس کامِ جاں کا یوں ہی تھا سایا گیا

شاید جگر حرارتِ عشقی سے جل گیا
کل دردِ دل کہا سو مرا منھ اُبل گیا
ہرچند میں نے شوق کو پنہاں کیا ولے
ایک آدھ حرف پیار کا مُنھ سے نکل گیا

ہم سے تو جز مرگ کچھ تدبیر بن آتی نہیں
تم کہو کیا تم نے دردِ عشق کا درماں کیا
داخلِ دیوانگی ہی تھی ہماری عاشقی
یعنی اس سودے میں ہم نے جان کا نقصاں کیا
شکر کیا اُس کی کریمی کا ادا بندے سے ہو
ایسی اک ناچیز مشتِ خاک کو انساں کیا
لکھنؤ دِلّی سے آیا، یاں بھی رہتا ہے اُداس
میرؔ کو سرگشتگی نے بے دل و حیراں کیا

بے دماغی کا سماں دیکھنے کی کس کو تاب
آنکھیں ملتا تھا جو وہ جی ہی جلا جاتا تھا
میرؔ کو واقعہ کیا جانیے کیا تھا درپیش
کہ طرف دشت کے جوں سیل چلا جاتا تھا

چشمِ وفا اخوانِ زماں سے سادہ ہو سو رکھے میرؔ
قصّہ ہے مشہورِ زمانہ پہلے دونوں بھائی کا

جہاں بھرا ہے ترے شورِ حُسن و خوبی سے
لبوں پہ لوگوں کی ہے ذکر جا بجا تیرا
نظر کسو نے نہ کی حال میرؔ پر افسوس
غریبِ شہر وفا تھا وہ خاکِ پا تیرا

صورتِ شیریں کے آگے کام اپنا کر گیا
عشق میں کس حُسن سے فرہاد ظالم مر گیا
خانہ آبادی ہمیں بھی دل کی یوں ہے آرزو
جیسے جلوے سے ترے گھر آرسی کا بھر گیا

کیا عشق سو پھر مجھے غم رہا   مژہ نم رہی حال درہم رہا

ق

مکے گیا، مدینے گیا، کربلا گیا
جیسا گیا تھا ویسا ہی چل پھر کے آگیا
دیکھا ہو کچھ اس آمد و شد میں تو میں کہوں
خود گم ہوا ہوں بات کی تہ اب جو پا گیا

جاں سوز آہ و نالہ سمجھتا نہیں ہوں میں
اک شعلہ میرے دل سے اُٹھا تھا جلا گیا
جورِ سپہرِ دوں سے بُرا حال تھا بہت
میں شرمِ ناکسی سے زمیں میں سما گیا

عشق کیا کیا آفتیں لاتا رہا آخر اب دُوری میں جی جاتا رہا
دل ہوا کب عشق کی رہ کا دلیل میں تو خود گم ہی اُسے پاتا رہا
کچھ نہ میں سمجھا جنونِ عشق میں دیر ناصح مجکو سمجھاتا رہا

کون لیتا تھا نام مجنوں کا جب کہ عہدِ جنوں ہمارا تھا
لطف سے پوچھتا تھا ہر کوئی جب تلک لطف کچھ تمھارا تھا
آستاں کی کسو کے خاک ہوا آسماں کا بھی کیا ستارا تھا
موسمِ گل میں ہم نہ چھوٹے حیف گشت تھا، دید تھا، نظارا تھا

خوب کیا جو اہلِ کرم کے جود کا کچھ نہ خیال کیا
ہم جو فقیر ہوئے تو ہم نے پہلے ہی ترک سوال کیا
میر سدا بے حال رہو ہو مہر و وفا سب کرتے ہیں

تم نے عشق کیا سو صاحب یہ کیا اپنا حال کیا

ہم کوے مغاں میں تھے ماہِ رمضاں آیا
صد شکر کہ مستی میں جانا نہ کہاں آیا
رسم اُٹھ گئی دُنیا سے اک بار مروت کی
کیا لوگ زمیں پر ہیں، کیسا یہ سماں آیا
بلبل بھی تو نالاں تھی پر سارے گلستاں میں
اک آگ پھنکی جب میں سرگرمِ فغاں آیا

بہار آئی چلو چمن میں ہوا کے اوپر بھی رنگ آیا
کہاں تلک گُل نہ ہووے غنچہ رہا مُندے منھ سو تنگ آیا
ہے چلے ہیں مونڈھے، پھٹی ہے کہنی، پھسی ہے چولی، پھنسی ہے مہری
قیامت اُس کی ہے تنگ پوشی، ہمارا جی تو بتنگ آیا
وہی ہے رونا وہی ہے کڑھنا وہی ہے شورش جوانی کی سی
بڑھاپا آیا ہے عشق ہی میں یہ میرؔ تم کو نہ ڈھنگ آیا

جُھک کے سلام کسو کو کرنا سجدہ ہی ہو جاتا ہے

سر جاوے گو اس میں میرا سر نہ فرو میں لاؤنگا

قیامت کو جُرمانہ شاعری پر — مرے سر سے میرا ہی دیوان مارا
لگا آتشیں نالۂ شب اپنے دل کو — اس انداز سے جیسے اک بان مارا

جگر خوں کیا چشم نم کر گیا — گیا دل سو ہم پر ستم کر گیا
اُن آنکھوں کو نرگس لکھا تھا کہیں — مرے ہاتھ دونوں قلم کر گیا

ہنگامے سے جہاں میں ہم نے جنوں کیا ہے
ہم جس طرف سے نکلے ساتھ اژدحام نکلا
جانا تھا تجکو ہم نے تو پختہ مغز ہو گا
دیکھا تو میرؔ تیرا سودا ابھی خام نکلا

نے ہم سے کچھ نہ اُس ستم ایجاد سے ہوا
ظلمِ صریح عشق کی امداد سے ہوا
خوش زمزمہ طیور ہی ہوتے ہیں میرؔ اسیر
ہم پر ستم یہ صبح کی فریاد سے ہوا

زار کیا، بیمار کیا، اس دل نے کیا آزار کیا
داغ سے تن گلزار کیا سب، آنکھوں کو خونبار کیا
چاہا ہم نے کیا کیا تھا پر اپنا چاہا کچھ نہ ہوا
عزت کھوئی، ذلت کھینچی، عشق نے خوار و زار کیا

سینے کا سوز بہت بھڑکا، جلا تن، مارا
جامہ زیبوں نے غضب آگ پہ دامن مارا

صبر مرا سا بے جرمی پر ہو نہ سکے گا انساں سے
جور و جفا و ستم جو گزرے سب کچھ میں نے میرؔ سہا

چاہت کا اظہار کیا سو اپنا کام خراب ہوا
اس پردے کے اُٹھ جانے سے اُس کو ہم سے حجاب ہوا
شمع جو آگے شام کو آئی رشک سے جل کر خاک ہوئی
صبح گلِ تر سامنے ہو کر جوشِ شرم سے آب ہوا

وفاداری نے جی مارا ہمارا اسی میں ہوگا کچھ وارا ہمارا

گلہ لب تک نہ آیا میرؔ ہرگز
کھپا جی ہی میں غم سارا ہمارا

ردیف: ب

ہوا جو دل خوں خرابی آئی تمام اعضا میں ہے فتور اب
حواس گم ہیں، دماغ گم ہے، رہا سہا بھی گیا شعور اب

کیا گئی جان و دل سے تاب شتاب
آنسو آتے ہیں اب شتاب شتاب
یوں صبا بھی شبک نہیں جاتی
جوں گیا موسم شباب شتاب
پیر ہو کر ہوا ہوں یوں غافل
جیسے لڑکوں کو آوے خواب شتاب

محروم نہ رہ جائیں کہیں بعدِ فنا بھی
ہے شبہ ہمیں یار کے دیدار میں صاحب
لیتی ہے ہوا رنگ سراپا سے تمہارے
معلوم نہیں ہوتے ہو گلزار میں صاحب
گو فہم نہ ہو کفر کی اسلام سے نسبت
رشتہ ہے عجب سبحہ و زُنّار میں صاحب

دردِ سر کا بہت پرہیز ہے اب زندگانی ہی دردِ سر ہے اب
وہ دماغِ ضعیف بھی نہ رہا بے دماغی ہی بیشتر ہے اب
کیا کہے حال خاطرِ آشفتہ دل خدا جانیے کدھر ہے اب
غزلتی میر جوں صبا اُس بِن خاک بر سر ہے دربدر ہے اب

کاش کے ہو جائے سینہ چاک چاک
رُکتے رُکتے جی بھی گھبرایا ہے اب

دُور تک رُسوا ہوا ہوں شہروں ملک ملک
میری شعر و شاعری کا تذکرہ گھر گھر ہے اب
گفتگو انسان سے محشر میں ہے یعنی کہ میر
سارا ہنگامہ قیامت کا مرے سر پر ہے اب

خلافِ وعدہ بہت ہوئے ہو کوئی تو وعدہ وفا کرو اب
ملا کے آنکھیں دروغ کہنا کہاں تلک کچھ حیا کرو اب

التفاتِ زمانہ پر مت جا میر دیتا ہے روزگار فریب

ردیف:- ت

جب سے ہماری آنکھیں لگی ہیں نیند نہیں آتی ہے رات
تکتے راہ رہے ہیں دن کو آنکھوں میں جاتی ہے رات
روز و شب کی اپنی معیشت نقل کریں کیا تم سے میر
دن کو قیامت جی پہ رہے ہے سر پہ بلا لاتی ہے رات

چشم رہنے لگی پُرآب بہت شاید آوے گا خونِ ناب بہت
مارنا عاشقوں کا گر ہے ثواب تو ہوا ہے تمھیں ثواب بہت

تھی ہجر کی سی لہر کہ آئی، چلی گئی
پہنچی ہے اُس سرے تئیں طبعِ رواں کی بات
اب تو وفا و مہر کا مذکور ہی نہیں
تم کس سے کی کہتے ہو یہ ہے کہاں کی بات

ردیف ث

عہد اُس کا غلط، قرار عبث
دل ہمارا ہے بے قرار عبث

ردیف ۔ ج

ملکوں ملکوں شہروں شہروں قریہ قصبہ دیہہ و دیار
شعر و بیت و غزل پہ اپنے ہنگامہ ہے گھر گھر آج
رحم نے جاگہ کی ہے پیدا شاید اُس کے دل میں بھی
دیکھ رہا ہے مُنھ کو ہمارے حال ہمارا سُن کر آج

ردیف ۔ چ

ہیں بے دماغِ عشق اُٹھا سو چلا گیا
بلبل پکارتی ہی رہی گلستاں کے بیچ

تحریک سے چلنے کی ہے جو دیکھو نگاہ کر
ہیئت کو اپنی موجوں میں آبِ رواں کے بیچ

کیا جانوں لوگ کہتے ہیں کس کو سرورِ قلب
آیا نہیں یہ لفظ تو ہندی زباں کے بیچ

خو گر ہوئے ہیں عشق کی گرمی سے خار وخس
بجلی پڑی رہے ہے مرے آشیاں کے بیچ

خوش سیرتی ہے جس سے کہ ہوتا ہے اعتبار
ہے چوبِ خشک، عُود نہ ہووے اگر کے بیچ

ہر دانۂ سرشک میں تارِ نگاہ ہے
اُس رشتے کی روش کہ جو ہووے گہر کے بیچ

ایک ہو دیں جو زبان و دل تو کچھ نکلے بھی کام
یوں اثر اے میرؔ کیا ہو گریۂ وزاری کے بیچ

بحث آ پڑی جو لب سے تمھارے تو چپ رہو
کچھ بولنا تمھیں نہیں اس گفتگو کے بیچ
گل کی تو بو سے غش نہیں آتا کسو کے تئیں
ہے فرق میرؔ پھول کی اور اُس کی بُو کے بیچ

ردیف: ح

کیا ہم بیاں کسو سے کریں اپنے یاں کی طرح
کی عشق نے خرابی سے اس خانماں کی طرح

اثباتِ بے ثباتی ہوا ہوتا آگے، تو
کیوں اس چمن میں ڈالتے ہم آشیاں کی طرح

نقصانِ جاں صریح تھا سودے میں عشق کے
ہم جان کے نکالی ہے جی کے زیاں کی طرح

دل کو جو خوب دیکھا تو ہُو کا مقام ہے
ہے اس مکاں میں ساری وہی لامکاں کی طرح

کل دیکھ آفتاب کو رویا ہوں دیر تک
غُصّے میں ایسی ہی تھی مرے مہرباں کی طرح

جو عرق تحریک میں اُس رشکِ مہ کے رُخ پہ ہے
میرؔ کب ہوتے ہیں گرمِ جلوہ تارے اس طرح

ردیف : د

تَن کو جس جاگہ سے چھیڑوں ہوں وہاں ہے دَرد دَرد
ہاتھ لگتے دل کے ہو جاتا ہوں کچھ میں زَرد زَرد
اب تو وہ حسرت سے آہ و نالہ کرنا بھی گیا
کوئی دَم ہونٹوں پہ آجاتا ہے گاہے سَرد سَرد

خود کو عشقِ بُتاں میں بھول نہ جا — متوکّل ہو، کر خدا کو یاد
چار دیوارئ عناصر میرؔ — خوب جاگہ ہے پر ہے بے بُنیاد

ردیف: ر

مت اس چمن میں غنچہ روش بود و باش کر
مانندِ گل شگفتہ جبیں یاں معاش کر

مرتے ہیں ہم تو آدمِ خاکی کی شان پر
اللہ رے دماغ کہ ہے آسمان پر
جمگھٹ تھا دل میں لالہ رخوں کے خیال سے
کیا کیا بہاریں دیکھی گئیں اس مکان پر
اُس کامِ جاں کے جلووں کا میں ہی نہیں ہلاک
آفت عجب طرح کی ہے سارے جہان پر
تقدیسِ دل تو دیکھ ہوئی جس کو اُس سے راہ
سر دے ہیں لوگ اُس کے قدم کے نشان پر
شوخی تو دیکھو آپ ہی کہا آؤ، بیٹھ میرؔ
پوچھا، کہاں؟ تو بولے کہ میری زبان پر!

کیا صبر ہم نے جو اُس کے ستم پر
ستم سا ستم ہو گیا اس میں ہم پر
لکھا جو گیا اُس کو کیا نقل کریئے
سخن خونچکاں تھے زبانِ قلم پر

عشق و محبت یاری میں اک لطف رکھے ہے کرتا ضبط
چھاتی پہ جو ہو کوہ الم کا تو بھی نالہ و آہ نہ کر
مانگ پناہ خدا کے بندے، دل لگنا اک آفت ہے
عشق نہ کر، زنہار نہ کر، واللہ نہ کر، باللہ نہ کر
میرؔ نہ ہم کہتے تھے تجھ سے، حال نہیں کچھ رہنے کا
جاہ بلائے جان و دل ہے، آجانے دے چاہ نہ کر

جی ہی مَلا جاتا ہے اپنا میرؔ سماں یہ دیکھے سے
آنکھیں ملتے اُٹھتے ہیں بستر سے دلبر جب سو کر

جو جانوں تجھ میں بلبل تہ نہیں تو کیوں زباں دیتا
زباں کر بند سارے باغ میں مجکو نہ رُسوا کر
سَبَد پھولوں بھرے بازار میں آنے ہیں، موسم ہے
نکل کر گوشۂ مسجد سے تو بھی میرؔ سودا کر

سُن سُن کے دردِ دل کو بولا کہ جانتے ہیں ہم
تو اپنی یہ کہانی بیٹھا ہوا کہا کر
جو وجہ کوئی ہو تو کہنے میں بھی کچھ آوے
باتیں کرو ہو بگڑی مُنھ کو بنا بنا کر

ق

بزم میں مُنھ اُدھر کریں کیونکر — اَور نیچی نظر کریں کیونکر
یوں بھی مشکل ہے دوں بھی مشکل ہے — سر جُھکا کر گزر کریں کیونکر
رازِ پوشیٔ عشق ہے منظور — آنکھیں رو رو کے تر کریں کیونکر
مست و بے خود ہم اس کے در پہ گئے — لوگ اُس کو خبر کریں کیونکر
دل نہیں درد مند اپنا میرؔ — آہ و نالے اثر کریں کیونکر

ردیف :- ز

لختِ جگر کے غم میں کہ تھا لعل پارہ میرؔ
رُخسارِ زرد پر ہے مرے خوں رواں ہنوز

کب سے نگاہ گاڑے ہے یاں روز آفتاب
ہم دیکھے ہیں جہاں کے تئیں سرسری ہنوز

بے قراری میں ساری عمر گئی
دل کو آتا نہیں قرار ہنوز

خاکِ مجنوں جہاں ہے صحرا میں
واں سے اُٹھتا ہے اک غبار ہنوز

کب سے ہے وہ خلافِ وعدہ ولے
دل کو اُس کا ہے اعتبار ہنوز

قیس و فرہاد پر نہیں موقوف
عشق لاتا ہے مردِ کار ہنوز

عشق کرتے ہوئے تجھے بیجود میرؔ
اُن کو اپنا ہے انتظار ہنوز

معتبر کیا ہے میرؔ کی طاقت
رہنِ بادہ ہے جانماز ہنوز

نہ جگر میں ہے خوں نہ دل میں خوں — در پئے خوں ہے روزگار ہنوز
دست بر دل ہوں مدتوں سے میرؔ — دل ہے ویسا ہی بیقرار ہنوز

ردیف: س

کل ہاتھ جا رہا تھا دلِ بے قرار پاس
گویا کہ جا رہا کسو سوزندہ نار پاس

ردیف :- ش

نکلے پردے سے روئے یار اے کاش
منہ کرے اس طرف بہار اے کاش
کچھ وسیلہ نہیں جو اُس سے ملوں
شعر ہو یار کا شعار اے کاش

جاتے ہیں رنگ و بوئے گل و آبجو چلے
آئی نہ خوش ہمیں تو یہ گلزار کی روش
یوں سر بکھیرے عشق میں پھرتے نہیں ہیں تیر
اظہار بھی کرے ہیں تو اظہار کی روش

ہے عشق میں صحبت مری خوباں کی عجب کچھ
اقرار سے بے زار ہیں، انکار سے ناخوش

ردیف :- ط

عشق کے دو گواہ لا، یعنی
زردیِ رنگ و چشمِ تر ہے شرط

ردیف:۔ ع

ایک ہی گُل کا صرف کیا ہے میں نے سراپا جیسے شمع
تلووں تک وہ داغ گیا ہے سب مجکو کھا جلیسے شمع

ردیف :- غ

دل جگر دونوں پر جلائے داغ
عشق نے کیا ہمیں دکھائے داغ

ردیف ف

آج ہمارا سر پھرتا ہے، باتیں جتنی سب موقوف
حرف و سخن جو باہم دیگر رہتے تھے سو اب موقوف
کس کو دماغ رہا ہے یاں اب آٹھ پہر کی منّت کا
ربطِ اخلاص کے وے دن گزرے خلط اُس سے سب موقوف

میں آگے نہ تھا دیدۂ پُر آب سے واقف
پلکیں نہ ہوئی تھیں مری خوناب سے واقف
ہم ننگِ خلائق یہ عجب ہے کہ نہیں ہیں
اس عالمِ اسباب میں اسباب سے واقف
شب آنکھیں کھلی رہتی ہیں ہم منتظروں کی
جوں دیدۂ انجم نہیں ہیں خواب سے واقف

نظر کیا کروں اُس کے گھر کی طرف — نگاہیں ہیں میری نظر کی طرف
بڑی دھوم سے ابر آئے گئے — نہ کوئی ہوا چشمِ تر کی طرف

رہا بے خبر گرچہ ہجراں میں میرؔ رہے گوش اُس کے خبر کی طرف

ردیف ۔ ق

لوگ بہت پوچھا کرتے ہیں، کیا کہیے میاں کیا ہے عشق
کچھ کہتے ہیں سرِّ الٰہی، کچھ کہتے ہیں خدا ہے عشق
الفت سے پرہیز کیا کر کلفت اس میں نہایت ہے
یعنی درد و رنج و تعب ہے آفتِ جان و بلا ہے عشق

دل کا مطالعہ کر رہے آگر حقائق
ہیں فنِ عشق کے بھی مشکل بہت دقائق
جی سارے تن کا کھنچ کر آنکھوں میں آرہا ہے
کس مرتبے میں ہم بھی ہیں دیکھنے کے شائق

نزدیک عاشقوں کے زمیں ہے قرارِ عشق
اور آسماں غبارِ سرِ رہگزارِ عشق
مارا پڑا ہے اُنس ہی کرنے میں ورنہ میر
ہے دور گرد وادیٔ وحشت شکارِ عشق

ردیف: ک

کچھ رنجِ دلی میرؔ جوانی میں کھنچا تھا
زردی نہیں جاتی مرے رخسار سے ابتک

لبالب ہے وہ حُسنِ معنی سے سارا
نہ دیکھا کوئی ایسی صورت سے ابتک

ردیف:۔ گ

کیا چلے جاتے ہیں جہان سے لوگ
مگر آئے تھے میہمان سے لوگ
شہر میں گھر خراب ہے اپنا
آتے ہیں یاں اب اس نشان سے لوگ
ایک گردش میں ہیں برابر خاک
کیا جھگڑتے ہیں آسمان سے لوگ
آدمی اب نہیں جہاں میں میر
اُٹھ گئے ایسے کاروان سے لوگ

ردیف: ل

رعنا جوان شہر کے رہتے ہیں گل بسر
سر پر ہمارے داغ جنوں کے ہیں جائے گل
دل ٹوٹنے پہ مرغِ چمن کے نہ کی نظر
بے درد گل فروش سبد بھر کے لائے گل
بوئے گل و نوائے خوش عندلیب تر
آئی، چلی گئی، یہی کچھ تھی وفائے گل

عشق کی چوٹیں پے در پے جو اُٹھا ئی گئیں گھائل ہے دل
یوں بیدم ہے اب پہلو میں جوں صیدِ بسمل ہے دل

کھنچتا ہے اُس طرف ہی کو بے اختیار دل
دیوانہ دل، بلازدہ دل، بے قرار دل
سمجھا بھی تو کہ دل کسے کہتے ہیں دل ہے کیا
آتا ہے جو زباں پہ تری بار بار دل

ردیف :- م

کیا رکھیں یہ تم سے توقع خاک سے آکے اُٹھاؤگے
راہ میں دیکھو افتادہ تو ادھر لگا ؤ بٹھو کر تم

یارب اُس محبوب کو پھر اک نظر دیکھیں گے ہم
اپنی آنکھوں سے اُسے یاں جلوہ گر دیکھیں گے ہم

ظلم ہوئے ہیں کیا کیا ہم پر، صبر کیا ہے کیا کیا ہم
آن لگے ہیں گور کنارے اُس کی گلی میں جا جا ہم

سوزِ دروں نے ہم کو پردے میں مار رکھا
جوں شمع آپ ہی کو کھا کھا کے رہ گئے ہم

اگرچہ وصل ہے پر ہیں طلب میں سرگرداں
نہ دہم کلّہ ہے جاتے ہیں جستجو کو ہم

مرید پیرِ خرابات یوں نہ ہوتے میر
سمجھتے عارف اگر اور بھی کسو کو ہم

کیا دن تھے وے دیکھتے تم کو نیچی نظریں کر لیتا
شرما شرما لوگوں سے جب آنکھیں مجکو دکھاتے تم
خاک ہے اصلِ طینتِ آدم چاہیے اس کو عجز کرے
بات کی تہ کو کچھ پاتے تو اتنا سر نہ اُٹھاتے تم

ردیف : ن

ضعفِ دماغ سے کیا پوچھو ہو اب تو ہم میں حال نہیں
اتنا ہے کہ تپش سے دل کی سر پر وہ دھمال نہیں
ایسی متاعِ قلیل کے اوپر چشم نہ کھولیں اہلِ نظر
آنکھیں آوے جو کچھ ہووے دُنیا ایسا مال نہیں

ہے وضع کشیدہ کا جو شور اُس کی جہاں میں
نکلی ہے مگر تازہ کوئی شاخ کماں میں

دل کے گئے بے دل کہلائے آگے دیکھیے کیا کیا ہوں
محزوں ہوویں مفتوں ہوویں مجنوں ہوویں رسوا ہوں
عشق کی رہ میں پاؤں رکھا سو رہنے لگے کچھ رفتہ سے
آگے چل کر دیکھیں ہم اب گُم ہوویں یا پیدا ہوں

ہر لحظہ بے قراری ہر آن آہ و زاری

ہر دم ہے اشکباری، نومیدی ہے نظر میں
روتے ہی رہنا اکثر تہ چاہتا ہے سو تو
تاب اب نہیں ہے دل کو نے خون ہے جگر میں

محبوب کا وصال نہ ہم کو ہوا نصیب
دل سے ہزار خواہشیں سر کو پٹک گئیں
بھر دی تھی چشمِ ساقی میں یارب کہاں کی مَے
مجلس کی مجلسیں نظر اک کرکے چھک گئیں

ہم سے اُسے نفاق ہوا ہے وفاق میں
کم اتفاق پڑتے ہیں یہ اتفاق میں
شاید کہ جان و تن کی جدائی بھی ہے قریب
جی کو ہے اضطراب بہت اب فراق میں
تحصیلِ علم کرنے سے دیکھا نہ کچھ حصول
میں نے کتابیں رکھیں اُٹھا گھر کے طاق میں
اک نور گرمِ جلوہ فلک پر ہے ہر سحر
کوئی تو ماہ پارہ ہے میرؔ اُس رواق میں

صبح ہوئی گلزار کے طائر دل کو اپنے ٹٹولے ہیں
یاد میں اُس خودرو گلِ تر کے کیسے کیسے بولے ہیں

غزل میر کی کب پڑھائی نہیں
کہ حالت مجھے غش کی آئی نہیں
زباں سے ہماری ہے صیاد خوش
ہمیں اب اُمیدِ رہائی نہیں
گلہ ہجر کا سُن کے کہنے لگا
ہمارے تمھارے جدائی نہیں

دل کی لاگ بُری ہوتی ہے، چنگے بھلے مر جاتے ہیں
آپ میں ہم سے بیخود رفتہ پھر پھر بھی کیا آتے ہیں
جی ہی جائے ہے میر ہوا پنا دیر کی جانب، کیا کریے
یوں تو مزاج طرف کعبے کے بہتیرا ہم لاتے ہیں

دل کی کچھ تقصیر نہیں ہے، آنکھیں اس سے لگ پڑیاں
مار رکھا سو اُن نے مجکو، کس ظالم سے جا لڑیاں
نحس تھے کیا وے وقت و ساعت جن میں لگا تھا دل اپنا
سال پہر ہے اب تو ہم کو، ماہ برابر ہیں گھڑیاں

جہاں کے باغ کا یہ عیش ہے کہ گل کے رنگ
ہمارے جام میں لوہو ہے سب شراب نہیں
تلاش میر کی اب میکدوں میں کاش کریں
کہ مسجدوں میں تو وہ خانماں خراب نہیں

ہم کو کہنے کے تئیں بزم میں جا دیتے ہیں
بیٹھنے پاتے نہیں ہیں کہ اُٹھا دیتے ہیں
اُس شہِ حسن کا اقبال کہ ظالم کے تئیں
ہر طرف سیکڑوں درویش دعا دیتے ہیں

جی مارا بیتابیٔ دل نے اب کچھ اچھا ڈھنگ نہیں
رنگ تپیدن کی شوخی سے مُنھ پر میرے رنگ نہیں
وہ جو خرامِ ناز کرے ہے ٹھوکر دل کو لگتی ہے
چوٹ کے اوپر چوٹ پڑے ہے، دل ہے میرا سنگ نہیں
ہم بھی عالمِ فقر میں ہیں پر ہم سے جو مانگے کوئی فقیر
ایک سوال میں دو عالم دیں، ایسے دل کے تنگ نہیں
شعرِ میر بھی پڑھتا ہے تو اور کسو کا لے کر نام

کیونکر کہیے اُس ناداں کو نام سے میرے ننگ نہیں

کچھ تفاوت نہیں ہستی و عدم میں ہم بھی
اُٹھ کے اب قافلۂ رفتہ کو جا لیتے ہیں
ہم فقیروں کو کچھ آزار تمھیں دیتے ہو
ورنہ اس فرقے سے سب لوگ دعا لیتے ہیں

تھکے چارہ جوئی سے اب کیا کریں — کہو تم سو دل کا مداوا کریں
بلا ہے یہ اندازِ رفتارِ عشق — چلا جاے جی، ہم تماشا کریں
بُرے حال اُس کی گلی میں ہیں میرؔ — جو اُٹھ جائیں واں سے تو اچھا کریں

کس قدر بے گانہ خو ہیں مردمانِ شہرِ حسُن
بات کرنا رسم و عادت ہی نہیں اُلفت سے یاں
اُٹھ گئے ہیں جب سے ہم سُونا پڑا ہے باغ سب
شورِ ہنگامِ سحر کا بند ہے مدّت سے یاں
صورتوں سے خاکداں یہ عالمِ تصویر ہے
بولیں کیا اہلِ نظر خاموش ہیں حیرت سے یاں

فہم حرفوں کے تنافر کا بھی یاروں کو نہیں
اس پہ رکھتے ہیں تنفر سب مری صحبت سے یاں
کیا سرِ جنگ و جدل ہو بے دماغِ عشق کو
صلح کی ہے میرؔ نے ہفتاد و دو ملت سے یاں

چاک ہوا دل ٹکڑے جگر ہے لوہو روئے آنکھوں سے
عشق نے کیا کیا ظلم دکھائے دس دن کے اس جینے میں
گوندھ کے گویا پتی گل کی وہ ترکیب بنائی ہے
رنگ بدن کا تب دیکھو جب چولی بھیگے پسینے میں
میرؔ نے کیا کیا ضبط کیا ہے شوق میں اشکِ خونیں کو
کہیے جو تقصیر ہوئی ہو اپنا لوہو پینے میں

کوچۂ یار تو ہے غیرتِ فردوس ولے
آدمی ایک نہیں اس کے ہواداروں میں

عالمِ علم میں ایک تھے ہم وے حیف ہے اُن کو گیان نہیں
اب کہتے ہیں خلطہ کیسا جان نہیں پہچان نہیں

کس اُمید پہ ساکن ہووے کوئی غریب شہر اُس کا
لطف نہیں، اکرام نہیں، انعام نہیں، احسان نہیں
شام وسحر ہم سرزدہ دامن سر بگریباں رہتے ہیں
ہم کو خیال اُدھر ہی کا ہے اُن کو ادھر کا دھیان نہیں
شور نہیں یاں سُنتا کوئی میرؔ قفس کے اسیروں کا
گوش نہیں دیوارِ چمن کے، گُل کے شاید کان نہیں

یوں ناکام رہیں گے کب تک جی میں ہے اک کام کریں
رُسوا ہو کر مارے جاویں اُس کو بھی بدنام کریں
مُنھ کھولے تو روزِ روشن زُلف بکھیرے شام ہے پھر
ان طوروں سے عاشق کیوں کر صبح کو اپنی شام کریں
شیخ پڑے محرابِ حرم میں پہروں دوگانہ پڑھتے ہیں
سجدہ ایک اُس تیغ تلے کا ان سے ہو تو سلام کریں

ق

پھرا مَیں صورتِ احوال ہر اک کو دکھاتا یاں
مروّت قحط ہے آنکھیں نہیں کوئی ملاتا یاں

خرابہ دلّی کا دہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا
وہیں مَیں کاش مر جاتا سراسیمہ نہ آتا یاں
محبت دُشمنِ جاں ہے جو میں معلوم یہ کرتا
تو کاہے کو کسو سے میرؔ اپنا دل لگاتا یاں

کس سے مشابہ کہیے اُس کو، ماہ میں ویسا نُور نہیں
کیونکر کہیے بہشتی رُو ہے اس خوبی سے حُور نہیں
ہم دیکھیں تو دیکھیں اُسے پھر پردہ بہتر ہے، یعنی
اَور کریں نظارہ اُس کا ہم کو یہ منظور نہیں
راہِ دُورِ عدم سے آئے بستی جان کے دُنیا میں
سو یاں دگھر اوجڑے ہیں سارے، اک منزل معمور نہیں

ردیف :- و

دیتی ہے طُول بلبل کیا شورشِ فغاں کو
اک نالہ حوصلے سے بس ہے وداعِ جاں کو

نالاں تو ہیں مجھی سے پر وہ اثر کہاں ہے
گو طائرِ گلستاں سیکھے مری زباں کو

کیا جانیے کہ کیا کچھ پردے سے ہوئے ظاہر
رہتے ہیں دیکھتے ہم ہر صبح آسماں کو

اُس چشمِ سُرخ پر ہے وہ ابروے کشیدہ
جوں تُرکِ مَست رکھلے سر کے تلے کماں کو

بعد از نماز تھے کل میخانے کے در اوپر
کیا جانے میرؔ اُٹھ کر واں سے گئے کہاں کو

دل میرؔ دلبروں سے چاہا کرے ہے کیا کیا
کچھ انتہا نہیں ہے عاشق کی آرزو کو

عجب گر تیری صورت کا نہ کوئی یار عاشق ہو
جو صحنِ خانہ میں تو ہو در و دیوار عاشق ہو
تجھے اک بار اگر دیکھے کوئی بے جا ہو دل اُس کا
خرامِ ناز پہ تیرے لٹا گھر بار عاشق ہو

تُو وہ نہیں کسو کا تہِ دل سے یار ہو
یا تجکو دل شکستوں سے اخلاص پیار ہو

صد رنگ بحث رہتی ہے یاں ذی شعور سے
اے عقلمند وائے کہ ناداں ہوا نہ تُو

کھول آنکھیں صبح سے آ گئے کہ شیر اللہ ہے
بجھتے رہتے ہیں غافل وقت کر گئے [illegible]

کیا کیا جھمک گئے ہیں رخسارِ یار [illegible]
رہ رہ گئے ہیں وہ خود آئینہ وار [illegible]
دن ہیں بڑے کسو کے [illegible]

رہتے نہیں ہیں یکساں لیل و نہار دونو

جو نہ ہووے نماز کریے نیاز　　آدمی چاہیے کرے کچھ تو
سہمے سہمے نظر پڑے ہیں میرؔ　　اُس کے اطوار سے ڈرے کچھ تو

ردیف: ھ

یار صد حیف کہ بیگانہ رہا اپنے ساتھ
آشنا یا نہ نہ کی کوئی ادا اپنے ساتھ

اتحاد اتنا ہے اُس سے کہ ہمیشہ ہے وصال
اپنے مطلوب کو ہے ربط سدا اپنے ساتھ

رنج نے رنج بہت کھینچے پہنچکر ہم تک
اک بلا میں ہے گرفتار بلا اپنے ساتھ

واردِ شہر ہیں یا دشت میں ہم، شوقِ طلب
ہر زماں پھرتا ہے اے میرؔ لگا اپنے ساتھ

یاروں کی آہ و زاری ہووے قبول کیونکر
اُن کی زباں پہ کچھ ہے، دل میں ہے کچھ، دعا کچھ

ساری وہی حقیقت ملحوظ سب نیں رکھتی
کیسے نمود ہو دے جو اُس کے ماسوا کچھ

کیا اضطرابِ عشق سے میں حرف زن ہوں میرؔ
مُنھ تک جگر تو آنے لگا گفتگو کے ساتھ

رگڑے گئے ہیں جبّہ اندبسکہ راہتوں کے
آئینہ ہو رہا ہے وہ سنگِ آستانہ

غمِ فوت سے بندے آزاد رہ
خدا ہے تو کیا غم ہے دل شاد رہ

چاہ میں دل پر ظلم و ستم ہے جور و جفا ہے کیا کیا کچھ
درد و الم ہے کلفت و غم ہے رنج و بلا ہے کیا کیا کچھ
عاشق کے مرجانے کے اسباب بہت رُسوائی میں
دل بھی لگا ہے، شرم و حیا ہے، مہر و وفا ہے کیا کیا کچھ
دل لینے کو فریفتہ کے بہتیرا کچھ ہے یار کنے
غمزہ و عشوہ چشمک، چتون ناز و ادا ہے کیا کیا کچھ
حسرت وصل اندوہ جُدائی خواہشِ کاہش ذوق و شوق
یوں تو چلا ہوں اکیلا لیکن ساتھ چلا ہے کیا کیا کچھ

کیا کہیے جب میں نے کہا ہے تیرا ہے مغرورؔ اُس پر تو
اپنی زباں مت کھولؔ تو اُن نے اور کہا ہے کیا کیا کچھ

ردیف ا۔ ے

میں تو تنگ صبری سے اپنی رہ نہیں سکتا اک دم بھی
ناز و غرور بہت ہے اُس کا لطف نہیں ہے کم کم بھی

نقدِ دل غفلت سے کھویا راہ کھوٹی کر گئے
کارواں جاتا رہا ہم خواب ہی میں مر گئے
واعظِ ناکس کی باتوں پر کوئی جاتا ہے میرؔ
آؤ میخانے چلو تم کس کے کہنے پر گئے

اے کاش کوئی جا کر کہہ آئے یار سے بھی
یاں کام جا چکا ہے اب اختیار سے بھی
یک معنیٔ شگفتہ سو رنگ بندھ گئے ہیں
الوانِ گل ہیں ہر سو اب کی بہار سے بھی
جاں دہ ہوا سے گزرا میرؔ جن کی خاطر
بچ کر نکلتے ہیں وے میرے مزار سے بھی

خوار پھرایا گلیوں گلیوں سر مارے دیواروں سے
کیا کیا اُن نے سلوک کیے ہیں شہر کے عزّت داروں سے
وہ جو "ماہِ زمیں گرد" اپنا دُور پھرے ہے ان روزوں
شوق میں ہر شب حرف و سخن ہے ہم کو فلک کے تاروں سے

کچھ نہیں اور دیکھے ہیں کیا کیا خواب کا سا ہے یاں کا عالم بھی
حرمِ کعبے کا نہ پایا بھید نہ ملا واں کا ایک محرم بھی
کھپ ہی جاتا ہے آدمی اے میرؔ آفتِ جاں ہے عشق کا غم بھی

آتش خو مغرور سے ویسے عہدہ برآ ہو کیسا کوئی
دل کو جلاوے، منّت رکھے، جی مارے احسان کرے

یا مُستِ درگاہوں میں شب کرتے تھے شاہد بازیاں
تسبیح لے کر ہاتھ میں یا میرؔ اب حضرت ہوئے

باغ میں سیر کبھو ہم بھی کیا کرتے تھے
روشِ آبِ رواں سیلے پھرا کرتے تھے

غیرتِ عشق کسو وقت بلا تھی ہم کو
تھوڑی آزردگی میں ترکِ وفا کرتے تھے
مائلِ کفر جوانی میں بہت تھے ہم لوگ
دَیر میں مسجدوں سے دیر رہا کرتے تھے
اب تو بے تابیٔ دل نے ہمیں ہٹھلا ہی دیا
آگے رنج و تعبِ عشق کھنچا کرتے تھے

دُنیا کی قدر کیا جو طلبگار ہو کوئی
کچھ چیز مال ہو تو خریدار ہو کوئی
کیا ابرِ رحمت اب کے برستا ہے لطف سے
طاعت گزیں جو ہو سو گنہگار ہو کوئی
چپکے ہیں ہم تو حیرتِ حالاتِ عشق سے
کریے بیاں جو واقفِ اسرار ہو کوئی
یکساں ہوئے ہیں خاک سے پامال ہو کے ہم
کیا اَوَر اُس کی راہ میں ہموار ہو کوئی
کیا اضطرابِ دل سے کہے میرؔ سِرِّ عشق
یہ حال سمجھے وہ جو گرفتار ہو کوئی

اُن حنائی دست و پا سے دلگی سی ہے ابھی
میں نے ناخن بندی اپنی عشق میں کی ہے ابھی

اے کاش قیامت میں دیویں اُسے عاشق کو
گر حسنِ عمل کی واں لوگوں کو جزا دینگے

دیر سے ہم کو بھول گئے ہو، یاد کرو تو بہتر ہے
غم حرماں کا کب تک کھینچیں، شاد کرو تو بہتر ہے
زخمِ دامندارِ جگر سے جامہ گزاری ہو نہ سکی
ظلم نمایاں اب کوئی ایجاد کرو، تو بہتر ہے
عشق میں دم مارا نہ کبھو تم چپکے چپکے روئے میرؔ
لوہو مُنھ سے مل کر اب فریاد کرو تو بہتر ہے

جگر کے مگر زخم سب بھر گئے　　لہو میری آنکھوں میں آتا نہیں

اے کاش اب نہ چھوڑے صیاد قیدیوں کو
جی ہی سے مارتی ہے آزادی بے پری کی

گزرے بسانِ صرصر عالم سے بے تامل
افسوس میر تم نے کیا سیر سرسری کی

حسرت سے دیکھ رہتیو اسے نامہ بر منہ اُس کا
بس اور کچھ نہ کہتیو ہرگز مری زبانی
یہ میر تو غم اپنا برسوں کہا کریں گے
اب رات کم ہے سوؤ بس ہو چکی کہانی

چلو چمن میں جو دل کھلے ٹک ہم غمِ دل کہا کریں گے
طیور ہی سے بکا کریں گے گلوں کے آگے بُکا کریں گے
وصالِ خوباں نہ کر تمنا کہ زہر شیریں لبی ہے اُن کی
خراب و رسوا جُدا کریں گے ہلاک مِل کر جدا کریں گے
مگر وہ رشکِ بہار سمجھے کہ رنگ اپنا بھی ہے اب ایسا
ورق خزاں میں جو زرد ہوں گے غمِ دل اُس پر لکھا کریں گے
غمِ محبت میں میر ہم کو ہمیشہ جلنا ہمیشہ مرنا
صعوبت ایسی دماغ رفتہ کہاں تلک ہم وفا کریں گے

سُنو سرگزشت اب ہماری زبانی | سُنی گرچہ جاتی نہیں یہ کہانی
بہت نذریں مانیں کہ مانے وہ کہنا | ولیکن مری بات ہرگز نہ مانی
ملا دیتی ہے خاک میں آدمی کو | محبّت ہے کوئی بلا آسمانی

چلتے ہو تو چمن کو چلیے، کہتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھُول کھِلے ہیں، کم کم باد و باراں ہے
رنگ ہوا سے یوں ٹپکے ہے جیسے شراب چُواتے ہیں
آگے ہو میخانے کے نکلو عہدِ بادہ گساراں ہے
دل ہے داغ، جگر ہے ٹکڑے، آنسو سارے خُون ہوئے
تو ہو پانی ایک کرے یہ عشقِ لالہ عذاراں ہے

گرچہ نظر ہے پُشتِ پا پر، لیکن قہر قیامت ہے
گڑ جاتی ہے دل میں ہمارے آنکھ اُس کی شرمائی ہوئی
جنگل جنگل شوق کے مارے ناقہ سوار پھرا کی ہے
مجنوں جو صحرائی ہوا تو لیلیٰ بھی سودائی ہوئی
دُودِ دلِ سوزانِ محبّت محو جو ہو تو عرش پہ ہو
یعنی دُود نجھے گی جا کر عشق کی آگ لگائی ہوئی

جنون کے انداز سے ظالم ترکِ مروّت پیدا ہے
اہلِ نظر سے چھپتی نہیں ہے آنکھ کسو کی چھپائی ہوئی
میرؔ کا حال نہ پوچھو کچھ تم کہنہ رباط سے پیری میں
رقص کناں بازار تک آئے عالم میں رسوائی ہوئی

موسم ہے نکلے شاخوں سے پتّے ہرے ہرے
پودے چمن میں پھولوں سے دیکھے بھرے بھرے
آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے
مرتا تھا میں تو باز رکھا مرنے سے مجھے
یہ کہہ کے "کوئی ایسا کرے ہے ارے ارے"
گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگِ گل سے میرؔ
بلبل پکاری دیکھ کے صاحب پرے پرے

ہمارے میرؔ سے مودّت ہے دوستداری ہے
ہزار سابقوں سے سابق ایک یاری ہے
نگاہ غور سے کر میرؔ، سارے عالم میں

کہ ہے جو عینِ حقیقت وہی تو ساری ہے

نہ خاطر پہ الم تیرے، نہ دل پر کچھ ستم تیرے
محلِ رحم ہو ویں کس طرح مظلوم ہم تیرے

عشق میں کھوئے جاؤگے تو بات کی تہ بھی پاؤگے
قدر ہماری کچھ جانو گے دل کو کہیں جو لگاؤگے
صبر کہاں بے تابیِ دل سے چین کہاں بے خوابی سے
سو سو بار گلی میں تیکتے گھر سے باہر آؤ گے
رنگ محبت کے ہیں کتنے کوئی تمھیں خوش آوے گا
خون کروگے یا دل کو یا داغ جگر پہ جلاؤگے

فرہاد و قیس گزرے اب شور ہے ہمارا
ہر کوئی اپنی نوبت دو دن بجا گیا ہے
رسوا، خراب، غم کش، دل خستہ محبت
عاشق کو تیرے غم میں کیا کیا کہا گیا ہے

ق اے میرؔ شعر کہنا کیا ہے کمالِ انساں
یہ بھی خیال سا کچھ خاطر میں آگیا ہے
شاعر نہیں جو دیکھا تو تُو ہے کوئی ساحر
دو چار شعر پڑھ کر سب کو رِجھا گیا ہے

اگرچہ مارا بگڑ کے مجکو ولیک لطف و کرم سے پھر بھی
نشان میرے مزار کا وہ سرِ رہ اپنی بنا گیا ہے

صبر کر رہ جو وہ عتاب کرے ورنہ کیا جانے کیا خطاب کرے
عشق میں دل بہت ہے بے آرام چین دیوے تو کوئی خواب کرے
وقت یاں کم ہے چاہیے آدم کرنا جو کچھ ہو سو شتاب کرے
میرؔ اُٹھ بُتکدے سے کعبے گیا کیا کرے جو خدا خراب کرے

کسو سیاق سے تحریرِ طولِ شوق نہ ہو
زبانِ خامہ لساں اس میں قاصر ہے

دل کی نہیں بیماری ایسی جس میں ہو اُمّید بہی

کیا سنبھلے گا میرِ ستم کش وہ تو مارا غم کا ہے

فرصت ہے یاں کم رہنے کی، بات نہیں کچھ کہنے کی
آنکھیں کھول کے کان جو کھولو بزمِ جہاں افسانا ہے

ہیں اُس کی جُدائی میں تصدیع بہت پائی
دروایشی و کم پائی، بے صبری و تنہائی
تھا صبر و سکوں جب تک رہتا تھا مجھے غش سا
بے تابیٔ دل سر پہ ایک اَور بلا لائی

عالم ہیئتِ مجموعی سے ایک عجیب مرقع ہے
ہر صفحے میں ورق میں اُس کے دیکھیے تو عالم دیکھیے

خواہشِ دل سے جی کی تاب گئی
آنکھیں اُس سے لگیں سو خواب گئی
بوسے گل یا نوا سے بلبل تھی
عمر افسوس کیا شتاب گئی
نمکِ حُسن سبز سے اے میرؔ
ساری کیفیتِ شراب گئی

دیکھ رہیے خرامِ ناز اُس کا ۔۔ پر کسو پاس جب رہا بھی جائے
دردِ دل طول سے کہے عاشق ۔۔ روبرو اُس کے جو کہا بھی جائے
کیا کوئی اُس گلی میں آوے میر ۔۔ آوے تو لوہو میں نہا بھی جائے

اس دشت سے غُبار ہمارا نہ ٹک اُٹھا
ہم خانماں خراب نہ جانا کدھر رہے
دونوں طرف سے دیدہ درائی نہیں ہے خوب
اس چاہ کا ہے لطف جو آپس میں ڈر رہے

دیوانِ نجم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیوانِ نجم

دل رفتہ جمال ہے اُس ذو الجلال کا
مستجمع جمیع صفات و کمال کا
ادراک کو ہے ذاتِ مقدس میں دخل کیا
اودھر نہیں گزار گمان و خیال کا
ہے قسمتِ زمین و فلک سے غرض نمود
جلوہ وگرنہ سب میں ہے اُس کے جمال کا
مرنے کا بھی خیال رہے نجمؔ اگر تجھے
ہے اشتیاق جانِ جہاں کے وصال کا

عشق تو بن رسوائے عالم باعث ہے رُسوائی کا
میل ولے اُس خود سر سے ہے جو ماتا ہے خدائی کا
فرقت میں ہے ہر عضو اُس کا جوں عضوِ از جا رفتہ نجمؔ

جو گشتہ ہے ظلم رسیدہ اُس کے درد جدائی کا

دُور بہت بھاگو ہو ہم سے سیکھے طریق غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ہے کیا اچھی آنکھوں والوں کا
سرو لبِ جُو، لالہ و گل، نسرین و سمن ہیں، شگوفے بھی
دیکھو جدھر اک باغ لگا ہے اپنے رنگیں خیالوں کا
غُنچہ ہوا ہے خارِ بیاباں بعد زیارت کرنے کے
پانی تبرک کرتے ہیں سب پاؤں کے میرے چھالوں کا

اگر ہنستا اُسے سیرِ چمن میں اب کے پاؤں گا
تو بلبل آشیاں تیرا بھی میں پھولوں سے چھاؤں گا
دماغ نازبرداری نہیں ہے کم دماغی سے
کہاں تک ہر گھڑی کے روٹھے کو پھر پھر مناؤں گا
ابھی ہوں منتظر جاتی ہے چشمِ شوق ہر جانب
بلند اُس تیغ کو ہونے تو دو سر بھی جھکاؤں گا

رسوائے شہر ہے یاں حرف و سخن ہمارا

کیا خاک میں ملا ہے افسوس فن ہمارا
ظلِ ریاض میں شب مہتاب کے نہیں گل
انگاروں سے بھرا ہے اُس بن چمن ہمارا

سخن مشتاق ہے عالم ہمارا
غنیمت ہے جہاں میں دم ہمارا
رہے ہم عالمِ مستی میں اکثر
رہا کچھ اور ہی عالم ہمارا
رکھے رہتے ہیں دل پر ہاتھ اے میرؔ
یہیں شاید کہ ہے سب غم ہمارا

کیا پوچھو ہو کیا کہتے میاں دل نے بھی کیا کام کیا
عشق کیا، ناکام رہا، آخر کو کام تمام کیا
کہنے کی بھی، لکھنے کی بھی، ہم تو قسم کھا بیٹھے تھے
آخر دل کی بے تابی سے خط بھیجا، پیغام کیا
ریگستاں میں جا کے رہیں یا سنگستاں میں ہم جوگی
رات ہوئی جس جاگہ ہم کو ہم نے وہیں بسرام کیا
میرؔ جو اُن نے مُنھ کو اُدھر کر ہم سے کوئی بات کہی
لطف کیا احسان کیا انعام کیا، اکرام کیا

عشق ہو حیوان کا یا اُنس ہو انسان کا
لاگ جی کی جس سے ہو دشمن ہے اپنی جان کا
عاشق و معشوق کی ہیں طرفہ صحبت سیر کی
ایک جی مارے ہے، مرہون ایک ہے احسان کا
مرنا اُس کے عشق میں خالی نہیں ہے حُسن سے
رشک کے قابل ہے جو کُشتہ ہے اس میدان کا
گر پڑیں گے ٹوٹ کر اکثر ستارے چرخ سے
ہل گیا جو صُبح کو گوہر کسو کے کان کا
ہر ورق ہر صفحے میں اک شعرِ شور انگیز ہے
عرصۂ محشر ہے عرصہ میرے بھی دیوان کا
بات کرتے جائے ہے مُنھ تک مخاطب کے جھلک
اُس کا لعلِ لب نہیں محتاج رنگِ پان کا
کیا کہوں مارا زمانہ کُشتہ و مُردہ ہے میرؔ
اُس کے اک انداز کا اک ناز کا اک آن کا

عشق ہمارے خیال پڑا ہے خواب گئی آرام گیا
جی کا جانا ٹھہر رہا ہے صُبح گیا یا شام گیا

عشق گیا سو دین گیا، ایمان گیا، اسلام گیا
دل نے ایسا کام کیا کچھ جس سے میں ناکام گیا
ہائے جوانی کیا کیا کہیے شور سروں میں رکھتے تھے
اب کیا ہے وہ عہد گیا وہ موسم وہ ہنگام گیا

طوفِ مشہد کو کل جو جاؤں گا — تیغِ قاتل کو سر چڑھاؤں گا
وصل میں رنگ اُڑ گیا میرا — کیا جدائی کو منھ دکھاؤں گا
چھانتا ہوں کسو گلی کی خاک — دل کو اپنے کبھو تو پاؤں گا
اُس کے در پر گئی ہے تاب و تواں — گھر تلک اپنے کیو نکے جاؤں گا

خیال چھوڑ دے واعظ تو بے گناہی کا
رکھے ہے شوق اگر رحمتِ الٰہی کا

پہلو سے اُٹھ گیا ہے وہ نازنیں ہمارا
جز درد اب نہیں ہے پہلو نشیں ہمارا
حرف و سخن تھے اپنے یا داستاں جہاں میں
مذکور بھی نہیں ہے یا اب کہیں ہمارا

کیا خاک میں ملایا ہم کو سپہرِ دوں نے
ڈھونڈے سے نشانِ تربت پاتے نہیں ہمارا
حالت ہے نزع کی یاں، آؤ کہ جاتے ہیں ہم
آنکھوں میں منتظر ہے دم واپسیں ہمارا

آج ہمارا دل تڑپے ہے کوئی اُدھر سے آوے گا
یا کہ نوشتہ اُن ہاتھوں کا قاصد ہم تک لاوے گا
عاشق ہووے وہ بھی یارب تا کچھ اُس سے کہا جاوے
یعنی حال سُنے گا دل سے، دل جو کسو سے لگاوے گا
چتون بیڈھب، آنکھیں بھری ہیں، پلکوں سے بھی نظر چھوٹی
عشق ابھی کیا جانیے ہم کو کیا کیا میرؔ دکھاوے گا

طائف رستہ کعبے کا جو کوئی مجھ سے پوچھے گا
جانبِ دَیر اشارت کرکے راہ اُدھر کی بھلاؤں گا

خوگر ہونا حُزن و بکا سے میرؔ ہمارا یوں ہی نہیں
برسوں روتے کُڑھتے رہے تب ہم دل کو غمناک کیا

بعد ہمارے اس فن کا جو کوئی ماہر ہووے گا
درد آگیں انداز کی باتیں اکثر پڑھ پڑھ رووے گا

ناگاہ جس کو عشق کا آزار ہو گیا
سہل آگے اُس کے مردنِ دُشوار ہو گیا
ہے حُسن کیا متاع کہ جس کو نظر پڑی
وہ جان بیچ کر بھی خریدار ہو گیا

ترے غم کے ہیں خواہاں سب نہ کھا غم
کمی کیا ہو گی جو اک میں نہ ہوں گا
نہ وہ آوے نہ جاوے بے قراری
کسی دن میرؔ یوں ہی مر رہوں گا

میرؔ نہ اپنے دردِ دل کو مجھ سے کہا کر روز و شب
صُبح جو گوشِ دل سے سُنا تھا دل میں میرے دَرد ہوا

آگے عالم عین تھا اُس کا اب عینِ عالم ہے وہ

اُس وحدت سے یہ کثرت ہے یاں میرا سب گیان گیا
مطلب کا سر رشتہ گم ہے، کوشش کی کوتاہی نہیں
جو طالب اس راہ سے آیا خاک بھی یاں کی چھان گیا
خاک سے آدم کر دکھلایا یہ منت کیا تھوڑی ہے
اب سر خاک بھی ہو جاوے تو سر سے کیا احسان گیا
کیونکے جہت ہو دل کو اُس سے میرؔ مقامِ حیرت ہے
چاروں اُور نہیں ہے کوئی، یاں واں یوں ہی دھیان گیا

دل تڑپے ہے جان کھپے ہے حال جگر کا کیا ہو گا
مجنوں مجنوں لوگ کہے ہیں مجنوں کیا ہم سا ہو گا

صنعتگریاں بہتیری کیں، لیک دریغ ہزار دریغ
جس سے یار بھی ملتا ہم سے ایسا وہ نہ ہنر آیا
گل تھے سو سو رنگ، پر ایسا شورِ طیور بلند نہ تھا
اُس کے رنگِ چمن میں شاید کوئی پھول نظر آیا

غزل مسلسل

اب یاں سے ہم اُٹھ جائیں گے، خلقِ خدا، ملکِ خدا
ہرگز نہ ایدھر آئیں گے، خلقِ خدا، ملکِ خدا
مطلب اگر یاں گُم ہوا اندیشے کی جاگہ نہیں
جاکر کہیں کچھ پائیں گے، خلقِ خدا، ملکِ خدا
دل میں نہ جانے یہ کوئی ہم کھانے کو دیتے ہیں انھیں
جو ہے مقدر کھائیں گے، خلقِ خدا، ملکِ خدا
گو لکھنؤ ویراں ہوا، ہم اور آبادی میں جا
مقسوم اپنا لائیں گے، خلقِ خدا، ملکِ خدا
اس بستی سے اُٹھ جائیں گے درویشوں کی کیا مشورت
وہ بھی یہی فرمائیں گے، خلقِ خدا، ملکِ خدا
تو میرؔ ہووے گا جہاں، امرِ قضا کے تابعاں
روزی تجھے پہنچائیں گے، خلقِ خدا، ملکِ خدا

اُس کی ہی جو چلے ہے راہ تو کیا
آسماں پر گیا ہے ماہ تو کیا
لڑکے ملنا ہے آپ سے بےلطف
یار ہووے نہ عذرخواہ تو کیا
کب رُخِ بدر ایسا روشن ہے
ایک شب کا ہے اشتباہ تو کیا
دل رہے وصل جو مدام رہے
مل گئے اُس سے گاہ گاہ تو کیا

ایک اللہ کا بہت ہے نام جمع باطل ہوں سو الٰہ تو کیا
میرؔ کیا ہے فقیرِ مستغنی آوے اُس پاس بادشاہ تو کیا

بے تابیوں کے جور سے میں جب کہ مر گیا
ہو کر فقیر صبر مری گور پر گیا

دل گیا مُفت اور دُکھ پایا ہو کے عاشق بہت میں پچھتایا
جب سے بے خود ہوا ہے اُس کو دیکھ آپ میں میرؔ پھر نہیں آیا

بات کہتے جی کا جانا ہو گیا مرنا عاشق کا بہانا ہو گیا
جائے بودن تو نہ تھی دُنیائے دوں اتفاقاً اپنا آنا ہو گیا
ماہ اُس کو کہہ کے سارے شہر میں مجھ کو مشکل مُنھ دکھانا ہو گیا
رفتہ رفتہ اُس پری کے عشق میں میرؔ سا دانا دِوانا ہو گیا

چاہ میں جور ہم پہ کم نہ ہوا عاشقی کی تو کچھ ستم نہ ہوا
یار ہمراہِ نعش جب دَم تھا وائے مُردے میں بھرے دم نہ ہوا

تنگ پوشی تنگ وہ رزی اُس کی جی میں کھُپ گئی
کیا ہی وہ محبوبِ خوش ترکیب، خوش پوشاک تھا

جُدا اُس سیم تن سے کیسا سونا
کہ مٹی کوڑے کا اب ہے بچھونا
بہت کی جستجو اُس کو نہ پایا
ہمیں درپیش ہے اب جی کا کھونا
تماشا دیکھنے ہنستا چلا آ
کرے ہے شیشہ بازی میرا رونا
جگر کے زخم ہیں شاید نمک بند
مزہ کچھ آنسوؤں کا ہے سلونا
وصیت میرؔ نے مجھکو یہی کی
کہ سب کچھ ہونا تو عاشق نہ ہونا

سر مارنا پتھر سے یا ٹکڑے جگر کرنا
اس عشق کی وادی میں ہر نوع بسر کرنا

دل کے خوں ہونے کا غم کیا اب سے تھا
سینہ کوبی سخت ماتم کب سے تھا
اُس کی مقتولی کا ہم کو رشک ہے
دو قدم جو کُشتہ آگے سب سے تھا

بزم کی عیش شب کا ہاں دن ہوتے ہی یہ رنگ ہوا
شمع کی جاگہ دُودِ تنک تھا، خاکستر پروانا تھا
طرفہ خیال کیا کرتا تھا عشق و جنوں میں روز و شب
روتے روتے ہنسنے لگا یہ میرؔ عجب دیوانا تھا

ناخن سے بوالہوس کا گلا یوں ہی چھِل گیا
لوہو لگا کے وہ بھی شہیدوں میں مِل گیا
شبنم کی سی نمود سے میں تھا عرق عرق
یعنی کہ ہستی ننگِ عدم تھی، خجل گیا

عالمِ مستی کیا عالم تھا غمِ دُنیا و دیں کا نہ تھا
ہوش آیا ہے جب سے، سر میں شوق رہا اُس عالم کا

تنہائی، بے کسی مری یک دشت تھی کہ میں
جیسے جرس کا نالہ جرس سے جُدا گیا

غربت ہے دل آویز بہت شہر کی اُس کے

آیا نہ کبھو ہم کو خیال اپنے وطن کا
جب زمزمہ کرتی ہے صدا چُبھتی ہے دل میں
بلبل سے کوئی سیکھ لے انداز سخن کا

ردیف : ب

عالم کے لوگوں کا ہے تصویر کا سا عالم
ظاہر کھُلی ہیں آنکھیں، لیکن ہیں بے خبر سب
میرؔ اس خرابے میں کیا آباد ہووے کوئی
دیوار و دَر گرے ہیں، ویراں پڑے ہیں گھر سب

عشق و جنوں کی کیا اب تدبیر ہے مناسب
زنجیر ہے مناسب، شمشیر ہے مناسب

چور، اُچکّے، سکھ، مرہٹّے، شاہ و گدا زر خواہاں ہیں
چین میں ہیں جو کچھ نہیں رکھتے فقر ہی اک دولت ہے اب

موسمِ گل کا شاید آیا داغ جنوں کے سیاہ ہوئے
دل کھنچتا ہے جانبِ صحرا، جی نہیں لگتا گھر میں اب

باہم ہوئی ہے ترکِ ملاقات کیا سبب
اب کم بہت ہے ہم پہ عنایات کیا سبب
ہم تو تمہارے حُسن کی حیرت سے ہیں خموش
تم ہم سے کوئی کرتے نہیں بات کیا سبب
اُس کی نگاہِ مَست تو اودھر نہیں پڑی
مسجد جو ہو گئی ہے خرابات کیا سبب

دل کے گئے بےکس کہلائے ایسا کہاں ہمدم ہے اب
کون ایسے محروم و غمیں کا ہمراز و ہمدم ہے اب
سینہ زنی ہے، غمزدگی ہے، سر دُھننا ہے، رونا ہے
دل جو ہمارا خون ہوا ہے اس سے بلا ماتم ہے اب
زردیٔ چہرہ، تن کی نزاری، بیماری، پھر چاہت بھی
دل میں غم ہے، مژگاں نَم ہے، حال بہت درہم ہے اب
عشق ہمارا آہ نہ پوچھو کیا کیا رنگ بدلتا ہے
خون ہوا دل، داغ ہوا پھر، دردؔ ہوا پھر غم ہے اب
ملنے والو پھر ملیے گا، ہے وہ عالمِ دیگر میں
میرِ فقیر کو سُکر ہے یعنی، مستی کا عالم ہے اب

ردیف : ت

حرف وسخن اب ننگ ہوا ہے اُن لوگوں کا ساتھ اپنے
مُنھ کرنے سے جن کی طرف آتی تھی ہم کو عار بہت

بادِ صبا نے صحنِ چمن میں اُس چہرے کی چلائی بات
اس لب و لہجہ پر بلبل کو اُس کے آگے نہ آئی بات
دُور تلک قاصد کے پیچھے کچھ کہتا میں جاتا تھا
شوقِ ستمکش ظالم نے کیا رفتہ رفتہ بڑھائی بات
لعل کو نسبت اُن ہونٹوں سے دینا سب کا تصنع تھا
کچھ بن آئی جب نہ کسو سے تب یہ ایک بنائی بات
غیر سے کچھ کچھ کہتا تھا سو سامنے سے میرؔ آیا میں
پھیر لیا مُنھ میری طرف سے یعنی مجھ سے چھپائی بات

ارض و سما کی پستی بلندی اب تو ہم کو برابر ہے
یعنی نشیب و فراز جو دیکھے طبع ہوئی ہموار بہت

سو غیروں میں ہو عاشق تو ایک اُسی سے شرماویں
اس مستی میں آنکھیں اُسکی رہتی ہیں ہشیار بہت

کہہ کے فسانا عشق و وفا کا لوگ محبت کرتے تھے
اب وہ نازہ کہانی اُن کی گویا ہے مدت کی بات
کس کو دماغِ جواب رہا ہے ضعف سے ہم خاموش رہے
پھر دل بکنا نصیحت گر سے میرؔ یہ ہے طاقت کی بات

چشم رہتی ہے اب پُر آب بہت
دل کو میرے ہے اضطراب بہت
دیکھیے رفتہ رفتہ کیا ہووے
تابِ دل کم ہے پیچ و تاب بہت
پھر و لطف و کرم عنایت کم
ناز و خشم و جفا عتاب بہت
پُشتِ پا ہے چشمِ شوخ اُس کی
ہائے رہے ہم سے ہے حجاب بہت
واں تک اپنی دعا پہنچتی نہیں
عالی رُتبہ ہے وہ جناب بہت

درِ مسجد پہ ہو کر بے نوا بیٹھے ہیں یا ہادی
ہمیں تھے ورنہ میخانے کے تکیہ دار قیمت
نصیبوں میں ہمیں جن کے علیش وہ بھی میرؔ چلتے ہیں

جیتے ہیں ہم بھی جو مرنے کو تھے طپاںؔ، یاقسمت

ردیف ث

رات دن سنتا ہے نالے یوں نہیں کہتا کبھو
میرِ دل آزردہ کو کن نے ستایا ہے عبث

ردیف ج

کس تازہ مقتل پہ کشندے تیرا ہوا ہے گزارا آج
زہ دامن کی بھری ہے لہو سے کس کو تو نے مارا آج

کل تک ہم نے تم کو رکھا تھا سو پردوں میں کلی کے رنگ
صبح شگفتہ گل جو ہوئے تم سب نے کیا نظارا آج

چشمِ مشتاق اُس لب و رُخ سے لحظہ لحظہ اُٹھتی نہیں
کیا ہی لگے ہے اچھا اُس کا مکھڑا پیارا پیارا آج

اب جو نسیم معطر آئی شاید بال کھلے اُس کے
شہر کی ساری گلیاں ہوگئیں گویا عنبر سارا آج

میر ہوئے ہو بیخود کب کے آپ میں بھی تو ٹک آؤ
ہے دروازے پر انبوہ اک رفتۂ شوق تمہارا آج

اُس کا بحرِ حسن سراسر اوج و موج و تلاطم ہے
شوق کی اپنی نگاہ جہاں تک جاوے بوس و کنار ہے آج

جذبِ عشق جدھر چاہے ہے لے جاوے ہے محمل لیلیٰ کا

یعنی ہاتھ میں مجنوں کے ناقے کی اُس کے مہاہے آج

رنگ یہ ہے دیدۂ گریاں سے آج
لوہو ٹپکتا ہے گریباں سے آج

جہاں کے لوگوں میں جس کی تھی کل تمیزِ عزت
اُسی عزیز کو دیکھا ذلیل و خوار ہے آج
سحر سواد میں چل زرد پھولی ہے سرسوں
ہوا ہے عشق ہی کل زرد کیا بہار ہے آج

ردیف :- چ

وعدے کرو ہو برسوں کے تم دَم کا بھروسا ہم کو نہیں
کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے یاں اک پل ایک آن کے بیچ

فصلِ گُل میں اسیر ہوئے تھے مَن کی رہی ہے مَن کے بیچ
اُس پہ ستم یہ تازہ ہے ہم پر۔ قید کیا ہے چمن کے بیچ

اُس کے رنگ کھِلا ہے شاید کوئی پھول بہار کے بیچ
شور پڑا ہے قیامت کا سا چار طرف گلزار کے بیچ
کوئی شکارِ زخم خوردہ سے جا کے کہے ٹک پھر کر دیکھ
کوئی سوار ہے تیرے پیچھے گرد و خاک و غبار کے بیچ
چشمک غمزہ عشوہ کرشمہ آن انداز و ناز و ادا
حُسن سوائے حسنِ ظاہر، تیر بہت ہیں یار کے بیچ

اے بُوئے گُل سنبھل کے مہکیو یون کے بیچ

زخمی پڑے ہیں مرغ ہزاروں چمن کے بیچ

ردیف :- ح

لہو میں ڈوبے دیکھیو دامان و جیب تر
بھرا ہے آج دیدۂ خونبار بے طرح

وہ نوبادۂ گلشنِ خوبی سب سے رکھے ہے نرالی طرح
شاخِ گل سا جائے ہے لہکا اُن نے نئی یہ ڈالی طرح

ردیف :- خ

جھمک سے اُس کے بدن میں ہر ایک جا ہے شوخ
بہ رنگِ برق سراپا وہ خود نما ہے شوخ

ردیف :- د

برسوں میں اقلیمِ جنوں سے دو دیوانے نکلے تھے
میرؔ آوارہ شہر ہوا ہے، قیس ہوا ہے بیاباں گرد

کم ناز سے ہے کس کے بندے کی بے نیازی
قالب میں خاک کے یاں پنہاں خدا ہے شاید
قیدِ فراق سے تو چھوٹیں جو مر رہیں ہم
اس دردِ بے دوا کی مرنا دوا ہے شاید

حیرت سے حسنِ گُل کی چُپکا ہوا ہوں ورنہ
طیرانِ باغ میں ہوں میں خوش زباں زد

کچھ ہوش نہ تھا منبر و محراب کا ہم کو
صد شکر کہ مسجد میں ہوئے مستی میں وارد

ردیف :- ر

اپنے موئے بھی رنج و بلا ہے ہمسایوں کی جانوں پر
کیا کیا سینہ زنی رہتی ہے درد و غم کے فسانوں پر
تو بھی رباطِ کہن سے صوفی سیر کو چل ٹک سبزے کی
ابرِ سیہ قبلے سے آکر جھوم پڑا میخانوں پر
بعد مرے تسبیح کو میرے ہاتھوں ہاتھ ملک لیں گے
سو سو بار لیا ہے میں نے نام اُس کا ان دانوں پر
دل کی حقیقت عرش کی عظمت سب کچھ ہے معلوم ہمیں
سیر رہی ہے اکثر اپنی ان پاکیزہ مکانوں پر
راہ چلو تم اپنی اپنی میرے طریق سے کیا تم کو
آنکھوں سے سجدہ میں نے کیا ہے واں پاؤں کے نشانوں پر

کئی داغ ایسے جلائے جگر پر | کہ دے نرگسی زن تھے گل ہائے تر پر
طرف شاخِ گل کی لچک کے نہ دیکھا | نظر میر کی تھی کسو کی کمر پر

جہاں میں نہ کی میں نے اقامت کی نیت — کہ مشعر تھا آنا مرا یاں سفر پر

عشق خدائی خراب ہے ایسا جس نے کھوئے ہیں گھر کے گھر
کعبہ و دَیر کے ایوانوں کے گرے پڑے ہیں دَر کے دَر
مسلم و کافر کے جھگڑے میں جنگ و جدل سے رہائی نہیں
لوتھوں پہ لوتھیں گرتی رہیں گی کٹتے رہیں گے سر کے سر

چاہ کا جو اظہار کیا تو فرطِ شرم سے جان گئی
عشقِ شہرت دوست نے آخر مارا مجھکو رسوا کر

زور ہوا ہے چل صوفی ٹک تو بھی رباطِ کہنہ سے
ابرِ قبلہ بڑھتے بڑھتے آیا ہے میخانے پر

روزوں میں رہ سکیں گے ہم بے شراب کیونکر
گزرے گا اتقا میں عہدِ شباب کیونکر
تھوڑے سے پانی میں بھی چل نکلے ہے اکثر تا
بے تہ ہے سر نہ کھینچے اکدم حباب کیونکر

اُجڑے نگر کو دل کے دیکھوں ہوں جب کھوں ہوں
اب پھر بسے گی ایسی بستی خراب کیونکر

سُنا تم نے جو گزرا سانحہ ہجراں میں یاروں پر
قیامت غم سے ہر ساعت رہی اُلفت کے ماروں پر
بڑی دولت ہے درویشی جو ہو ہمرہ قناعت کے
کہ عرصہ تنگ ہے حرص و ہوا سے تاجداروں پر

کہتے ہیں راہ پائی زاہد نے اُس گلی کی
روتا کہیں نہ آوے ایمان و دیں کو کھو کر
ہے نظم کا سلیقہ ہر چند سب کو لیکن
جب جانیں کوئی لاوے یوں موتی سے پرو کر
کس کس ادا سے فتنے کرتے ہیں قصد اُدھر کا
جب بے دماغ سے تم اُٹھ بیٹھتے ہو، سو کر
احوال میرؔ جی کا مطلق گیا نہ سمجھا
کچھ زیرِ لب کہا بھی، سو دیر دیر رو کر

پھولوں کا موسم کاٹ کے ہو پردے سے ہواکے چشمک زن
گل کھائے ہیں ہزار خزاں میں مرغِ چمن نے بہار بغیر

کیا دیکھتا ہے ہر گھڑی اپنی ہی سج کو شوخ
آنکھوں میں جان آئی ہے ادھر نگاہ کر
رحمت اگر یقینی ہے تو کیا ہے زہد، شیخ
اے بے وقوف جانے عبادت گناہ کر
جھپید گی، داغ سے مت منہ کو اپنے موڑ
اے زخمِ کہنہ دل سے ہمارے نباہ کر
اس وقت ہے دعا و اجابت کا وصل میرؔ
اک نعرہ تو بھی پیشِ صبح گاہ کر

شوریدہ سر رکھا ہے جب سے اُس آستاں پر
میرا دماغ تب سے ہے ہفتم آسماں پر
پر کالے آگ کے تھے کیا نالہائے بلبل
شبنم سے آبلے ہیں گل برگ کی زباں پر

یک قطرہ آب اُس بن میں نے اگر پیا ہے
نکلا ہے میرؔ پانی وہ خونِ ناب ہو کر

ابرِ سیہ قبلے سے اُٹھ کر آیا ہے میخانے پر
بادہ کشوں کا جھرمٹ ہے کچھ شیشے کچھ پیمانے پر
بے تابانہ شمع یہ آیا، گرد پھرا، پھر جل بجھ گیا
اپنا جی بھی حد سے زیادہ رات جلا پروانے پر

ہم کو مٹی کر دیا پامالیٔ گردوں نے میرؔ
وہ نہ آیا ناز کرتا ٹک ہماری خاک پر

ردیف : ز

اُس زلف و کاکل کو گوندھے دیر ہوئی مشاطہ کو
سانپ سے پر لہراتے ہی ہیں بال اُس کے بل کھائے ہنوز
آنکھ لگے اک مدت گزری پائے عشق جو بیچ میں ہے
ملتے ہیں معشوق اگر تو ملتے ہیں شرمائے ہنوز
ایسی معیشت کر لوگوں سے جیسی غم کش میرؔ نے کی
برسوں ہوئے ہیں اُٹھ گئے اُس کو روتے ہیں ہمسائے ہنوز

برسوں سے لکھنؤ میں اقامت ہے مجکو لیک
یاں کے چلن سے رکھتا ہوں عزمِ سفر ہنوز

سرکش ہے تند خو ہے عجب ہے زباں دراز
آتش کا ایسا لائحہ کب ہے زبان دراز
پروانہ تیری چرب زباں سے ہوا ہلاک
اے شمع تو تو کوئی غضب ہے زبان دراز

ردیف: س

یار ہم سے جُدا ہوا افسوس — نہ جُدا ہو کے پھر ملا افسوس
سب سے بیگانگی کی جس کے لیے — وہ نہیں ہم سے آشنا افسوس
رات دن ہاتھ ملتے رہتے ہیں — دل کے جلنے کا ہے بڑا افسوس
مجکو کرنا تھا احتراز اُس سے — ہائے افسوس کیا کیا افسوس
نوشدارو ہے نیشِ دارو میرؔ — متاثر نہیں دوا افسوس

صد پارہ گلا تیرا ہے کر ضبطِ نفس بس
سُنتا نہیں اس قافلے میں کوئی جرس بس
کیا میرؔ اسیروں کو درِ باغ جو وا ہو
ہے رنگِ ہوا دیکھنے کو چاکِ قفس بس

نہ معرّف نہ آشنا کوئی — ہم ہیں بے یار و بے دیا افسوس

کوئی دن کریے معیشت جا کسو کامل کے پاس

ناقصوں میں رہیے کیا، رہیے تو صاحبدل کے پاس

ردیف :۔ ش

کیسا خود گم سر بکھیرے میرؔ ہے بازار میں
ایسا اب پیدا نہیں ہنگامہ آرا دل فروش

عمرِ عزیز یاس ہی میں جاتی ہے چلی
اُمّید وار اُس کے نہ ہم ہوتے میرؔ کاش

ردیف :- ص

شاعری شیوہ ہے شعار خلاص دین و مذہب مرا ہے پیار خلاص
اب کہاں وہ مودتِ قلبی ہووے ظاہر میں گو ہزار خلاص

سورت اخلاص کی پڑھی برسوں
میرؔ رکھتا نہیں ہے یار اخلاص

ردیف :- ط

گل ہو کے برگ برگ ہوئے پھر ہوا ہوئے
رکھتے تھے اس چمن کے جو غنچے صبا سے ربط
زنہار پشتِ پا سے نہیں اُٹھتی اُس کی آنکھ
اُس چشمِ سُرمگیں کو بہت ہے حیا سے ربط

خام رہتا ہے آدمی گھر میں پختہ کاری کے تئیں سفر ہے شرط

ردیف : غ

سب سے کی دشمنی جنھوں کے لیے
وے ہیں نامہرباں دریغ دریغ
تب کھلی آنکھ میرؔ اپنی، جب
جا چکا کارواں، دریغ دریغ

ردیف: ف

صورت کی شیرینی ایسی تلخی زباں کی ایسی کچھ
مُنھ دیکھے اُس کا جو کوئی پھر دیکھے ہے زباں کی طرف

کیا نیچی آنکھیں دیکھو ہو تلوار کی طرف
دیکھو کنکھیوں ہی سے گنہگار کی طرف
شاید متاعِ حسُن کھلی ہے کسو کی آج
ہنگامہ حشر کا سا ہے بازار کی طرف
عاشق کی اُور ناز کناں جاوے ہے کبھو
جیسے طبیب جاوے ہے بیمار کی طرف

نظر کیوں گئی رو و مو کی طرف
کھنچا جاے ہے جی کسو کی طرف
نہ دیکھو کبھی موتیوں کی لڑی
جو دیکھو مری گفتگو کی طرف
اُسے ڈھونڈھتے میرؔ کھوئے گئے
کوئی دیکھے اس جستجو کی طرف

اے تجھ بغیر لالہ و باغ و بہار حیف
گل سے چمن بھرے ہوں نہ ہو تو ہزار حیف

ردیف :۔ ق

ق

عشق سے نظمِ کُل ہے یعنی عشق کوئی ناظم ہے خوب
ہر شئی یاں پیدا جو ہوئی ہے موزوں کرلایا ہے عشق
عشق ہے باطن اس ظاہر کا ظاہر باطن عشق ہے سب
اودھر عشق ہے عالمِ بالا ادھر کو دُنیا ہے عشق
دائر سائر ہے یہ جہاں میں جہاں تہاں متصرف ہے
عشق کہیں ہے دل میں پنہاں اور کہیں پیدا ہے عشق
موج زنی ہے میرؔ فلک تک ہر لُجّہ ہے طوفاں زا
سرتاسر ہے تلاطم جس کا وہ اعظم دریا ہے عشق

ق

ارض و سما میں عشق ہے ساری چاروں اُور بھرا ہے عشق
ہم ہیں جنابِ عشق کے بندے نزدیک اپنے خدا ہے عشق
ظاہر و باطن اول و آخر پائیں بالا عشق ہے سب

نور و ظلمت، معنی و صورت سب کچھ آپ ہوا ہے عشق
ایک طرف جبرئیل آتا ہے ایک طرف لاتا ہے کتاب
ایک طرف پنہاں ہے دلوں میں ایک طرف پیدا ہے عشق
خاک و باد و آب و آتش سب ہے موافق اپنے تئیں
جو کچھ ہے سو عشق یہاں ہے کیا کہیے اب کیا ہے عشق

ردیف : ک

اب رنج و درد و غم کا پہنچا ہے کام جاں تک
پر حوصلے سے شکوہ آیا نہیں زباں تک

نعمتِ رنگا رنگِ حق سے بہرہ بختِ سیہ کو نہیں
سانپ رہا گو گنج کے اوپر کھانے کو تو کھائی خاک

ہر چند کہ دامن تئیں ہے چاکِ گریباں
ہم ہیں متوقع کفِ چالاک سے ابتک
گو خاک سی اُڑتی ہے مرے مُنھ پہ جنوں میں
ٹپکے ہے لہو دیدۂ نمناک سے ابتک

تین دن گور میں بھی بھاری ہیں
ہاتھ پہنچا نہ اُس کے دامن تک
عشقِ مردآزما نے آخر کار
یعنی آسودگی نہیں تہِ خاک
میں گریباں کروں نہ کیونکر چاک
کیے فرہاد و قیس و میرؔ ہلاک

مقصود گم ہے پھرتا جو رہتا ہے رات دن
ہلکان ہو کے ہو گا کبھو آسماں ہلاک

اُس ظلم کیش کی ہے طرب گاہ ہر کہیں
عاشق خدا ہی جانے ہوا ہے کہاں ہلاک

ردیف ۔ گ

تھا گردِ بوئے گُل سے بھی دامن ہوا کا پاک
کیا اب کے اس چمن سے گئی ہے بہار الگ

ردیف :- ل

ق

دِل دل لوگ کہا کرتے ہیں تم نے جانا کیا ہے دل
چشمِ بصیرت وا ہووے تو عجائب دید کی جا ہے دل
اوج و موج کا آشوب اُس کے ہے کہ زمیں سے فلک تک ہے
صورت میں تو قطرۂ خوں ہے معنی میں دریا ہے دل

آئی بہار نکلے چمن میں ہزار گل
دل جو کھلا فسردہ تو جوں بے بہار گل

دعویٰ حُسنِ سراپا تھا یہ نازاں تجکو دیکھ
شاخیں یہ گل جھک گئیں یعنی بہت شرمائے گل
کیا گلِ مہتاب و شبّو کیا سمن کیا نسترن
اس حدیقے میں نہ نقشِ پا سے اسکے پائے گل
اس چمن میں جلوہ گر جس حُسن سے خوباں ہیں نجم

موسمِ گل میں کہیں اس خوبی سے کب آئے گُل

ردیف :- م

چاہت آفت، اُلفت کلفت، مہر و وفا و رنج و بلا
عشق ہی کے سب نام ہیں یہ، دل کاش کہیں نہ لگاتے تم
شائق ہو مرغانِ قفس کے آئے گھر صیّادوں کے
پھول اک دو تسکین کو اُن کی کاش چمن سے لاتے تم

کیا کریں بے کس ہیں ہم بے بس ہیں ہم بے گھر ہیں ہم
کیونکر اُڑ کر پہنچیں اُس تک، طائر بے پر ہیں ہم

غزلِ مسلسل بطرزِ واسوخت

کہا سنتے تو کاہے کو کسو سے دل لگاتے تم
نہ جاتے اُس طرف تو ہاتھ سے اپنے نہ جاتے تم
شکیبائی کہاں جو اب رہے جاتی ہوئی عزت
کدھر وہ ناز جس سے سر فرو ہرگز نہ لاتے تم
یہ حسنِ خلق تم میں عشق سے پیدا ہوا، ورنہ

گھڑی کے روٹھے کو دو دو پہر تک کب مناتے تم
نظر دزدیدہ کرتے ہو، جھکا رکھتے ہو پلکوں کو
لگی ہوتیں نہ آنکھیں تو نہ آنکھوں کو چھپاتے تم
یہ ساری خوبیاں دل لگنے کی ہیں مت برا مانو
کسو کا بارِ منت بے علاقہ کیوں اٹھاتے تم
پھرا کرتے تھے جب مغرور اپنے حسن پر آگے
کسو سے دل لگا جو پوچھتے ہو آتے جاتے تم

سونے تو غنچہ ہو کسو گلخن کے آس پاس
اس تنگنا میں پاؤں بھی پھیلا سکے نہ ہم

ہم نہ کہا کرتے تھے تم سے دل نہ کسو سے لگاؤ تم
جی دینا پڑتا ہے اس میں ایسا نہ ہو پچھتاؤ تم

تظلم کے کھینچے الم پر الم　　ترحم کہ مت کر ستم پر ستم
علم بازی آہِ جاں کاہ سے　　رہے ٹوٹتے ہی الم پر الم
کئی بار آیا ادھر لطف سے　　عطا پر عطا ہے کرم پہ کرم

خطرناک تھی وادیٔ عشق میرؔ
گئے اس پہ بھی ہم قدم بر قدم

ردیف:۔ ن

پیری ہے اب تو کہیے سو کیا کہیے ہمنشیں
کس رنج وغم میں گزری ہیں اپنی جوانیاں
سُنتا نہیں ہے شعر بھی وہ حرف ناشنو
دل ہی میں خوں ہوا کیں مری نکتہ دانیاں
عالم کے ساتھ جائیں چلے کس طرح نہ ہم
عالم تو کا روان ہے ہم کا روانیاں

دراییں کہاں شور ایسا بھرا تھا
کسو کا مگر دل رکھا تھا جرس میں
تنِ زار و لاغر میں ظاہر رگیں ہیں
بھرا ہے مگو عشق ایک ایک نس میں
محبت، وفا، مہر کرتے تھے باہم
اُٹھا دی ہیں وے، تم نے اب ساری رسمیں
ہوا ہی کو دیکھے ہیں اے میرؔ اسیراں

لگا دیں مگر آنکھیں چاکِ قفس میں

شگفتہ خاطری اُس بن کہاں تھی — چمن میں غنچہ پیشانی رہا میں
تعارف ہمصفیروں سے نہیں کچھ — ہوا ہوں ایک مدت میں رہا میں

فریاد سے کیا لوگ ہیں دن ہی کو عجب میں
رہتی ہے خلش نالوں سے میرے دلِ شب میں
پایا نہ کنھوں نے اُسے کوشش کی بہت میرؔ
سب سالک و مجذوب گئے اُس کی طلب میں

کس کو دل سا مکان دیتے ہیں — اہل اس گھر پہ جان دیتے ہیں
کیونکے خوش خواں نہ ہوویں اہلِ چمن — ہم اُنھوں کو زبان دیتے ہیں

جب سے جدا میں اُن سے ہوں حال عجب ہے روز و شب
چشمِ تر سے ٹپکے ہیں آنسو، خشک لبوں پر آہیں ہیں
یہ بھی سماں خوش ترکیبوں کا میرؔ نہ اپنے دل سے گیا
سوتے سے اُٹھ کر آنکھیں ملے ہیں لے انگڑائی جماہیں ہیں

ہر چند میرے حق میں کم اُس کا ستم نہیں
پر اِس ستم سے بامزہ لطف و کرم نہیں
حیرت میں سکتے سے بھی مرا حال ہے پرے
آئینہ رکھ کے سامنے دیکھا تو دم نہیں
شاید جگر کا کام تمامی کو کھنچ گیا
یا لوہو روتے رہتے تھے یا چشم نم نہیں

دل جلتے کچھ بن نہیں آتی حال بگڑتے جاتے ہیں
جیسے چراغِ آخرِ شب ہم لوگ نبڑتے جاتے ہیں
ضعفِ دماغ سے اُفتاں خیزاں چلتے ہیں ہم راہ رواں
دیکھیں کیا پیش آوے اب تو گرتے پڑتے جاتے ہیں

عشق نے ہم کو مار رکھا ہے جی میں اپنے تاب نہیں
دل کو خیالِ صبر نہیں آنکھوں کو میلِ خواب نہیں
کوئی سبب ایسا ہو یارب جس سے عزت رہ جاوے
عالم میں اسباب کے ہیں پر پاس اپنے اسباب نہیں
رنگ شکستہ، دل ہے شکستہ سر ہے شکستہ تنی ہیں

حال کسو کا اپنا سا اس میخانے میں خراب نہیں

آنکھیں سفید دل بھی جلا انتظار میں
کیا کچھ نہ ہم بھی دیکھ چکے ہجرِ یار میں
دیکھیں تمھیں ایک روز تری مست انکھڑیاں
انگڑائیاں ہی لیتے ہیں اب تک خمار میں

طلب ہے کامِ دل کی اُس کے بالوں کی اسیری میں
گدائی شب کو کرتا ہوں خجالت سے فقیری میں
حزیں آواز ہے مرغِ چمن کی کیا جنوں آور
نہیں خوش زمزمہ ویسا ہماری ہمصفیری میں

عشق کے دیوانے کی سلاسل ہلتی ہے تو ڈریں ہیں ہم
بگڑے پیلِ مست کی سی زنجیروں کی جھنکاریں ہیں
بڑے بڑے تھے گھر جن کے یاں آثار اُن کے یہ ہیں اب
میر شکستہ دروازے ہیں گری پڑی دیواریں ہیں

حسن کیا جنس ہے جی اُس پہ لگا بیٹھے ہیں
غزلی شہر کے بازار میں آ بیٹھے ہیں
ہم وے ہر چند کہ ہم خانہ ہیں دونوں لیکن
روشِ عاشق و معشوق جُدا بیٹھے ہیں
کیونکے یاں اُس کا خیال آئے کہ آگے ہی ہم
دل سا گھر آتشیں آہوں سے جلا بیٹھے ہیں
ساری رات آنکھوں کے آگے ہی مرے رہتا ہے
گو کہ وے چاند سے مکھڑے کو چھپا بیٹھے ہیں

میخانے میں اس عالم کے لغزش پرستوں کی نہ جا
سُکر میں اکثر دیکھے ہم نے بڑے بڑے یاں ہشیاراں

یاری ہماری یکبارہی خاطر سے فراموش اُن نے کی
ذکر ہمارا اُس سے کیا سو کہنے لگا کچھ یاد نہیں

خوش چشم خوبرویاں دیدہ دراہیں کتنے
دُزدیدہ دیکھنے میں دل دیکھتے چرالیں

چلتے ہیں ناز سے جب ٹھوکر لگے ہے دل کو
آتی نہیں سمجھ میں ان دلبروں کی چالیں

میکشی صبح و شام کرتا ہوں فاقہ مستی مدام کرتا ہوں

ق

کوئی ناکام ہوں رہے کب تک میں بھی اب ایک کام کرتا ہوں
یا تو لیتا ہوں دادِ دل یا اب کام اپنا تمام کرتا ہوں

ردیف — و

دل کھلتا ہے واں صحبتِ رندانہ جہاں ہو
میں خوش ہوں اُسی شہر میں میخانہ جہاں ہو
ان اُجڑی ہوئی بستیوں میں دل نہیں لگتا
ہے جی میں وہیں جا بسیں ویرانہ جہاں ہو
وحشت ہے خردمندوں کی صحبت سے مجھے میرؔ
اب جا رہوں گا واں کوئی دیوانہ جہاں ہو

کیا فرض ہستی کی رُخصت ہے مجکو
کہیں اپنے رونے سے فرصت ہے مجکو
پھروں ہوں ترے عشق میں کوچہ کوچہ
مگر کوچہ گردی سے اُلفت ہے مجکو

ردیف : ھ

ہائے ستم ناچار معیشت کرنی پڑی ہر خار کے ساتھ
جان عزیز گئی ہوتی کاش اُنھے سال بہار کے ساتھ
وہ لحظہ نہیں جاتا جی سے آنکھ لڑی تھی جب اُس سے
چاہ نکلنی تھی باتوں سے چتون بھی تھی پیار کے ساتھ

اشعارِ میرؔ سب نے چُن چُن کے لکھ لیے ہیں
رکھیں گے یاد ہم بھی کچھ بیتیں چیدہ چیدہ

ہم جانتے تو عشق نہ کرتے کسو کے ساتھ
لے جاتے دل کو خاک میں اس آرزو کے ساتھ
تھا عکس اُس کے قامتِ دلکش کا باغ میں
آنکھیں چلی گئیں ہیں لگی آبجُو کے ساتھ
ہم زردکاہِ خُشک سے نکلے ہیں خاک سے
بالیدگی نہ خلق ہوئی اس نمو کے ساتھ

محتاجِ گُل نہیں ہے گریبانِ غم کشاں
گلزار اشکِ خوں سے ہے جیب و کنار دیکھ
خالی پڑا ہے خانہ دولت وزیر کا
باور نہیں تو آصف، آصف پکار دیکھ

ملتا رہا کشادہ جبیں خوب و زشت سے
کیا آئنہ کرے ہے بسر یاں حیا کے ساتھ
تدبیرِ دوستاں سے ہے بالعکس فائدہ
ہے دردِ عاشقی کو خصومت دوا کے ساتھ
کیا جانوں میں چمن کو ولیکن قفس پہ نیز
آتا ہے برگِ گُل کبھو کوئی صبا کے ساتھ

ردیف ۔ ی

دیکھ کے دستِ ویلائے نگاریں چُپکے سے رہ جائیں کیوں
مُنہ بولے ہے یارو گویا مہندی اُس کی رچائی ہوئی

دُود دلِ سوزانِ محبت موجود ہو تو عرش پہ ہو
دُور تجھے گی یعنی جاکر عشق کی آگ لگائی ہوئی

یہ یہ بلائیں سر پہ ہیں تو آج موئے کل دوسرا دن
یاری ہوئی بیماری ہوئی درویشی ہوئی تنہائی ہوئی

جب موسم تھا وا ہونے کا تب تو شگفتہ ٹک نہ ہوا
اب جو بہت افسردہ ہوا ہے دل ہے کلی مرجھائی ہوئی

کہنا جو کچھ جس سے ہوگا سامنے میرؔ کہا ہوگا
بات نہ دل میں پھر گئی ہوگی منہ پر میرے آئی ہوئی

مجکو مارا بھلا کیا تو نے یہ وفا کا بُرا کیا تو نے
حسرتیں اُس کی سرشکتی ہیں مرگِ فرہاد کیا کیا تو نے

آنکھوں کی طرف گوش کی دریردہ نظر ہے
کچھ یار کے آنے کی مگر گرم خبر ہے
یہ راہ و روش سروِ گلستاں میں نہ ہوگی
اُس قامتِ دلچسپ کا انداز دگر ہے
شانے پہ رکھا ہار جو پھولوں کا تو لچکی
کیا ساتھ نزاکت کے رگِ گل سی کمر ہے
کر کام کسو دل میں، گئی عرش پہ تو کیا
اے آہِ سحرگاہ اگر تجھ میں اثر ہے

کیا ہی دامنگیر تھی یارب خاکِ بسمل گاہِ وفا
اُس ظالم کی تیغ تلے سے ایک گیا تو دو آئے

جوں ابر بے کسانہ روتے اُٹھے ہیں گھر سے
برسے ہے عشق اپنے دیوار اور دَر سے
جمہور راہ اُس کی دیکھا کرے ہے اکثر
محفوظ رکھ الٰہی اُس کو نظر گزر سے
مُدّت سے چشم بستہ بیٹھا رہا ہوں لیکن

وہ رُوے خوب ہرگز جاتا نہیں نظر سے
شاید کہ وصل اُس کا ہووے تو جی بھی ٹھہرے
ہوتی نہیں ہے اب تو تسکینِ دل خبر سے
گلشن سے لے قفس تک آوازا ایک سی ہے
کیا طائرِ گلستاں ہیں نالہ کشِ اثر سے

میں چراغِ صبحگاہی ہوں نسیم
مجھ سے اک دم کے لیے کیا دشمنی

بسانِ برق وہ جھمکی دکھاوے ولے دل ٹھہرا ہے جو تاب لاوے

میدانِ غم میں قتل ہوئی آرزوے وصل
تھی اپنے خانمانِ تمنا میں اک یہی
اپنا لکھا ہے یاد مجھے میری بات بھول
قاصد نے جا کے یار سے کچھ اور ہی کہی

نہ تک کے شیخ اتنا بھی دا ہی تبا ہی

کہاں رحمتِ حق کہاں بے گناہی

اُٹھے ہے گردِ معشوقانہ اُس تربت سے عاشق کی
کبھو ٹک جس کے اوپر وہ سراپا ناز آتا ہے
عجب رنگِ حنا طائر ہے دستِ آموزِ خوباں کا
اُڑے ہے تو بھی ہاتھوں ہی میں کر پرواز آتا ہے
رہائی اپنی ہے دُشوار کب صیاد چھوڑے ہے
اسیرِ دام ہو طائر جو خوش آواز آتا ہے
اگر مسجد سے آوے میرؔ تو بھی لوگ کہتے ہیں
کہ میخانے سے پھر دیکھو وہ شاہد باز آتا ہے

یوں پھرتا ہوں دشت و در میں دُور اُس سے میں سرگشتہ
غم کا مارا آوارہ جوں راہ گیا ہو بھول کوئی
مستی، حُسن پرستی، رندی یہی عمل ہے مدت سے
پیر کبیر بھے تو کیا چھوٹے ہے معمول کوئی
حرف و حکایت شکر و شکایت تھی اک ضبع دو شیرہ پر
میرؔ کو جا کر ہم نے دیکھا ہے مردِ معقول کوئی

پتّا پتّا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے
عاشق سا تو سادہ کوئی اور نہ ہوگا دنیا میں
جی کے زیاں کو عشق میں اُس کے اپنا وارا جانے ہے
چارہ گری بیماریٔ دل کی رسمِ شہرِ حُسن نہیں
ورنہ دلبرِ ناداں بھی اس درد کا چارہ جانے ہے

ہم لوگوں کے لوہو میں ڈوبی رہی ہے اکثر
اُس تیغ کی جدول بھی کیا تیز بہا کی ہے

شکایت کروں ہوں تو سونے لگے ہے
مری سرگزشت اب ہوئی ہے کہانی
بسنتی قبا پر تری مر گیا ہے
کفن میر کو دیجیو زعفرانی

بے اس کے تیرے حق میں کوئی کیا دعا کرے
عاشق کہیں شتاب تو ہو وے خدا کرے

پتھر کی چھاتی چاہیے ہے میرؔ عشق میں
جی جانتا ہے اُس کا جو کوئی وفا کرے

عالم عالم عشق و جنوں ہے دُنیا دُنیا وحشت ہے
ایں دریا دریا روتا ہوں صحرا صحرا وحشت ہے
صُبح سے آنسو نومیدانہ جیسے وداعی آتا تھا
آج کسو خواہش کی شاید دل سے ہمارے رُخصت ہے

عشق کیا سو جان چلی ہے، اُلفت تھی یا کلفت تھی
کوُٹے گئے ہیں سب اعضا یہ محبت تھی یا محنت تھی
آبِ حیات وہی نا جس پر خضر و سکندر مرتے رہے
خاک سے ہم نے بھرا وہ چشمہ یہ بھی ہماری ہمت تھی

عشق و محبت کیا جانوں میں لیکن اتنا جانوں ہوں
اندر ہی اندر سینے میں مرے دل کو کوئی کھاتا ہے
عاشق اپنا جان لیا ہے اُن نے شاید میرؔ ہمیں
دیکھ بھری مجلس میں اپنی ہم ہی سے شرماتا ہے

ہیں تجرد سے اپنے ہیں روزِ جہاں سے گزرتا ہوں
وحشت ہے خورشید نمط اپنے بھی مجکو سائے سے

گردش دنوں کی کم نہ ہوئی کچھ گڑے ہوئے
روڑے رکھے غریبوں نے تو دن بڑے ہوئے
نرمی سے کوے یار میں جاوے تو جا نسیم
ایسا نہ ہو کہ اُکھڑیں کہیں دل گڑے ہوئے
آئے ہو بعدِ صلح کبھو ناز سے جو یاں
مُنہ پھیرا ادھر سے بیٹھے ہو جیسے لڑے ہوئے
بیمارِ اُمّیدوار سے بستر پہ اپنے ہم
دروازے ہی کی اُور تکتے ہیں پڑے ہوئے

ڈھونڈھ نکالا تھا جو اُسے سو آپ کو بھی ہم کھو بیٹھے
جیسا نہال لگایا ہم نے ویسا ہی پھل پایا ہے

دل کی لاگ بُری ہوتی ہے رہ نہ سکے ٹک جانے بھی
آئے بیٹھے اُٹھ بھی گئے بے تاب ہوئے پھر آئے بھی

تاجر ترک فقیر ہوئے اب شاعر عالم کامل ہیں
پیش گئی کچھ میرؔ نہ اپنی سوانگ بہت سے لائے بھی

کوئی نام اُس کا نہ لو جبر ہے — کہ بے تاب دل کی بنا صبر ہے
گلستاں کے ہیں دونوں پھبے — بہار اس طرف اُس طرف ابر ہے
درِ کعبہ پہ کفر بکتا ہے میرؔ — مسلماں نہیں وہ کہن گبر ہے

ظلم سہے ہیں داغ ہوے ہیں رنج اُٹھے ہیں درد کھنچے
اب وہ دل میں تاب نہیں جو لب تک آہِ سرد کھنچے

ہم پہ خشم و عتاب ہے سو ہے — وہی طرزِ خطاب ہے سو ہے
گرچہ گھبرا کے لب پہ آئی ولے — جان کو اضطراب ہے سو ہے

کیا کیا مکان شہ نشیں تھے وزیر کے
وہ اُٹھ گیا تو یہ بھی گرے بیٹھے ڈھ گئے

اُس کے روے خوے کردہ پہ نقاب لیے وہ صورت ہے

جیسے یکایک سطحِ ہوا پر بدلی آئی تابہ سے گئے

سارے عالم کے حواسِ خمسہ میں ہے انتشار
ایک ہم تم ہی نہیں معلوم ہوتے دوڈلے
تیر طئی ہو گا بیابانِ محبت کس طرح
راہ ہے پُر خار، میرے پاؤں میں ہیں آبلے

دامن پر فانوس کے تھا یوں ہی سا نشانِ خاکستر
شوق کی میں جو نہایت پوچھی جان جلے پروانے سے

گئے روزے اب دید وا دید ہے   گلے سے ہمارے ملو عید ہے
گریزاں ہوں سائے سے خورشید ساں   جہاں جب سے ہے مجکو تجرید ہے
تصرف میں جب ڈال دیتے ہیں بات   خدا رُخ کہے ہیں یہ توحید ہے

ہجر میں خوں ہوا تھا سب غم سے   دل نے پہلو تہی کیا ہم سے
عالمِ حسن ہے عجب عالم   چلیے عشق اس ہی عالم سے
طرح چھریوں کی پلکوں سے ڈالی   نکلی تلوار ابرو کے خم سے

درپئے خون میر کے نہ رہو	ہو بھی جاتا ہے جرم آدم سے

کل ہیں جو سیر میں تھا کیا پھول پھول بیٹھے
بلبل لیے ہیں گویا گلزار سب اجارے

کیا کہیے ویسی صورت گاہے نظر نہ آئی
ایسے گئے کہ اُن کی پھر کچھ خبر نہ آئی
روٹھے جو تھے سو ہم سے روٹھے ہوئے رہے وہ
کیا رویئے ہمیں تو منت بھی کر نہ آئی

داد فریاد جا بجا کریے	شاید اُس کے بھی دل میں جا کریے
دیکھیں کب تک رہے ہے یہ صورت	گالیاں کھائیے دعا کریے
کچھ کہیں گر تو وہ کہے نہ کہو	کیونکر اظہارِ مدعا کریے
اتفاق ان کا مارے ڈالے ہے	ناز و انداز کو جدا کریے
عید ہی کل نکلے رہے ہر روز	صبح اُس کے گلے لگا کریے
ہستی موہوم ویک سر و گردن	سیکڑوں کیونکے حق ادا کریے
وہ نہیں سرگزشت سنتا میر	یوں کہانی ہی کیا کہا کریے

گر یہ نظر ہے پُشتِ پا پر لیکن قہر قیامت ہے
گڑ جاتی ہے دل میں ہمارے آنکھ اُس کی شرمائی ہوئی
جنگل جنگل شوق کے مارے ناقہ سوار پھراکی ہے
مجنوں جو صحرائی ہوا تو لیلیٰ بھی سودائی ہوئی
چتون کے انداز سے ظالم ترکِ مروت پیدا ہے
اہلِ نظر سے چھپتی نہیں ہے آنکھ کسو کی چھپائی ہوئی

کیا کہتے اپنے عہد کے جتنے امیر تھے
ٹکڑے پہ جان دیتے تھے سارے فقیر تھے
دل میں گرہ ہوس رہی پروازِ باغ کی
موسم گلوں کا جب تیئں تھا ہم اسیر تھے
آرائشِ بدن نہ ہوئی فقر میں بھی کم
جا گہ اتو کے جامے پہ نقشِ حصیر تھے

کارواں گاہِ جہاں میں نہیں رہتا کوئی
جس کے ہاں دیکھتے ہیں چلنے کی طیاری ہے
وائے وہ طائرِ بے بال و ہوس ناک جسے

شوقِ گلگشتِ گلستاں میں گرفتاری ہے
آنکھ مستی میں کسو پر نہیں پڑتی اُس کی
یہ بھی اُس سادہ و پرکار کی ہشیاری ہے
واں سے جز ناز و تبختر نہیں کچھ، یاں سے میرؔ
عجز ہے دوستی ہے عشق ہے غمخواری ہے

زار رونا چشم کا کب دیکھتے
دیکھیے ہیں لیکن خدا جو کچھ دکھائے

کب تلک چاکِ قفس سے جھانکیے
برگِ گل یاں بھی صبا کوئی تو لائے

جو لکھی قسمت میں ذلت ہو سو ہو
خطِ پیشانی کوئی کیونکر مٹائے

میرؔ اکثر عمر کے افسوس میں
زیرِ لب بالائے لب ہے ہائے وائے

کافر کا بھی رویہ ہوتا نہیں ہے ایسا
ٹھوکر لگا کے چلنا کس دین میں روا ہے
پائے ثبات کس کا ٹھہرا ہے اُس کو دیکھے
ہے ناز اک قیامت، انداز اک بلا ہے
جو ہے سو میرؔ اُس کو میرا خدا لکھے ہے
کیا خاص نسبت اُس سے ہر فرد کو جدا ہے

ہر آن شکیب میں کمی ہے — بے تابی زماں زماں بہت ہے
اکثر پوچھے ہے جیتے ہیں میرؔ — اب تو کچھ مہرباں بہت ہے

صاحب ہو تم ہمارے بندے ہیں ہم تمہارے
موقوف رحم پر ہیں دشوار کام سارے
آشوبِ بحرِ ہستی کیا جانیے ہے کب سے
موج و حباب اُٹھکر لگ جاتے ہیں کنارے
کوئی تو ماہ پارہ ہے اس رواق میں بھی
چشمک کرے ہیں ہر شب جس کی طرف ستارے

نالہ جب گرمِ کار ہوتا ہے — دل کلیجے کے پار ہوتا ہے
مار رہتا ہے اُس کو آخرِ کار — عشق کو جس سے پیار ہوتا ہے
جبر ہے قہر ہے قیامت ہے — دل جو بے اختیار ہوتا ہے
کس کو پوچھے ہے کوئی دُنیا میں — دیر یاں اعتبار ہوتا ہے
آہ کس جلے بار کھولا میرؔ — یاں تو جینا بھی بار ہوتا ہے

حال ہم ڈوبتوں کا کیا جانے — جس کو دریا پہ سیرِ ساحل ہے

میرؔ کب تک یہ حالِ مرگ جیے ۔۔۔ کچھ بھی اس زندگی کا حاصل ہے

بے یار ہوں، بے کس ہوں، آگاہ نہیں کوئی
بے غم کر و خونریزی خونخواہ نہیں کوئی
میرؔ اتنی سماجت جو بندوں سے تو کرتا ہے
دُنیا میں مگر تیرا اللہ نہیں کوئی

دیدۂ گریاں ہمارا نہر ہے ۔۔۔ دل خرابہ جیسے دِلّی شہر ہے
یادِ زُلفِ یار جی مارے ہے میرؔ ۔۔۔ سانپ کے کاٹے کی سی یہ لہر ہے

موسمِ گل میں توبہ کی تھی واعظ کے میں کہنے سے
اب جو رنگ بہار کے دیکھے شرمندہ ہوں ندامت ہے

اے پریشاں ربط دیکھیں کب تلک یہ دو ہے
ہر گلی کوچے میں تیرا اک دعا گو آور ہے
طبع درہم، وضع برہم، زخم غائر، چشم تر
حالِ بد میں بے کسوں کے کچھ تمھیں بھی غور ہے

گردن کشِ زمانہ سو تیرا اسیر ہے
سلطانِ عصر تیری گلی کا فقیر ہے
جوں جوں بڑھاپا آتا ہے جاتے ہیں اینٹھنے
کس مٹی کا نہ جانیے اپنا خمیر ہے

ان بلاؤں سے کب رہائی ہے	عشق ہے، فقر ہے، جدائی ہے
استخواں کانپ کانپ جلتے ہیں	عشق نے آگ یہ لگائی ہے
اور کچھ مشغلہ نہیں ہے ہمیں	گاہ و بے گہ غزل سرائی ہے

ہے حوصلہ تیرا ہی جو تنگ نہیں آتا
کس سے یہ ستم ورنہ اے میر سہا جاوے

ترے بندے ہم ہیں خدا جانتا ہے	خدا جانے تو ہم کو کیا جانتا ہے
نہیں عشق کا درد لذت سے خالی	جسے ذوق ہے وہ مزا جانتا ہے
جفا اس پہ کرتا ہے حد سے زیادہ	جسے یار اہلِ وفا جانتا ہے
مرے دل میں رہتا ہے تو ہی جبھی تو	جو کچھ دل کا ہے مدعا جانتا ہے
مرا شعر اچھا بھی دانستہ ضد سے	کسو اور ہی کا کہا جانتا ہے

نہیں اتحّادِ تن و جاں سے واقف
ہمیں یار سے جو جُدا جانتا ہے

دیوان ششم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیوانِ ششم

فلک نے ہمیں کر سُرمہ بنایا نظر میں اُس کی ہیں تو بھی نہ آیا
زمانے میں مرے شورِ جنوں نے قیامت کا سا ہنگامہ اُٹھایا
تمامی عمر جس کی جُستجو کی اُسے پاس اپنے اکدم بھی نہ پایا
نہ تھی بیگانگی معلوم اُس کی نہ سمجھے ہم اُسی سے دل لگایا
حقِ صحبت نہ غیروں کو رہا یاد کوئی نہ دیکھا سیڑھی تک نہ لایا
عجب نقشہ ہے نقاشِ ازل نے کوئی ایسا نہ چہرہ پھر بنایا

لبنے ہوتے تو یا عتاب رہا بے دماغی سے یا خطاب رہا
ہو کے بے پردہ ملتفت بھی ہوا ناکسی سے ہمیں حجاب رہا
نہ اُٹھا لطف کچھ جوانی کا کم بہت موسمِ شباب رہا
کارواں ہائے صبح ہوتے گیا میں ستم دیدہ محوِ خواب رہا
گھر سے آنے لگی ہیں سحر یا رہی یار بن دیدہ اضطراب رہا

بے طاقتی نے دل کی گرفتار کر دیا
اندوہ و دردِ عشق نے بیمار کر دیا
دروازے پر کھڑا ہوں کئی دن سے یار کے
حیرت نے عشق کی مجھے دیوار کر دیا
نسبت ہوئی گناہوں کی ازبس مری طرف
بے جُرم اُن نے مجکو گنہگار کر دیا
دن رات ڈھونڈتے ہے اُسے دل، شوق نے مجھے
نایاب کس گہر کا طلب گار کر دیا

موے ہم جس کی خاطر بے وفا تھا
نہ جانا اُن نے تو یوں بھی کہ کیا تھا
معالج کی نہیں تقصیر ہرگز
مرض ہی عاشقی کا لادوا تھا
نہ خودسر کیونکے ہم ہوں یار اپنا
خودآرا خودپسند و خودستا تھا
رکھا تھا منہ کبھو اُس کُنجِ لب پر
ہمارے ذوق میں اب تک مزا تھا
ملے برسوں وہی بیگانگی تھی
ہمارے زعم میں وہ آشنا تھا
نہ دیوانے تھے ہم سے قیس و فرہاد
ہمارا طورِ عشق اُن سے جُدا تھا
صنم خانے سے اُٹھ کعبے گئے ہم
کوئی آخر ہمارا بھی خدا تھا
بدن میں اُس کے ہے ہر جائے دلکش
جہاں اٹکا کسو کا دل بجا تھا

چڑھی تیوری چمن میں میرؔ آیا گُلِ حسن آج شاید کچھ خفا تھا

سوزِ دروں سے ہم پہ ستم بر ملا ہوا
ٹکڑا جگر کا آنکھ سے نکلا، جلا ہوا

جمع اُس کے نکلے عالم ہو گیا جب تلک ہم جائیں ادھم ہو گیا
کیا نماز اے میرؔ اس اوقات کی جبکہ قد محراب سا خم ہو گیا

وہ دیکھنے ہمیں ٹک بیماری میں نہ آیا
سو بار آنکھیں کھولیں بالیں سے سر اُٹھایا
گلشن کے طائروں نے کیا بے مروتی کی
اک برگِ گل قفس میں ہم تک نہ کوئی لایا
نقشہ عجب ہے اُس کا نقاش نے ازل کے
مطبوع ایسا چہرہ کوئی نہ پھر بنایا

ق
باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سُنیے گا

پڑھتے کسو کو سُنیے گا تو دیر تلک سر دُھنیے گا
سعی و تلاش بہت سی رہے گی اس انداز کے کہنے کی
صحبت میں علما فضلا کی جا کر پڑھیے گُنیے گا

تھا اندوہ گرہ مدّت سے دل میں خون ہو درد ہوا
چاہ نے بدلے رنگ کئی اب جسم سراسر زرد ہوا

شاید کہ دل تڑپنے سے زخم درون پھٹا
خوناب میری آنکھوں سے مُنھ پر رواں ہوا
سایے میں تاک کے مجھے رکھا اسیر کر
صیاد کے کرم سے قفس آشیاں ہوا
وے تو کھڑے کھڑے مرے گھر آ کے پھر گئے
میں بے دیار و بے دل و بے خانماں ہوا
دو پھول لا کے پھینک دیے میری گور پر
یوں خاک میں ملا کے مجھے مہرباں ہوا

جس رفتنی کو عشق کا آزار ہو گیا

دو چار دن میں برسوں کا بیمار ہو گیا

نسبت بہت گناہوں کی میری طرف ہوئی
ناکردہ جرم میں تو گنہگار ہو گیا

بازار میں جہان کے ہے حسن کیا متاع
سوجی سے جس نے دیکھا خریدار ہو گیا

کرنا وفا نہیں ہے آسان عاشقی میں
پتھر کیا جگر کو تب چاہ کو نباہا

بلبل کا شور سن کے نہ مجھ سے رہا گیا
میں بے دماغ باغ سے اُٹھ کر چلا گیا

وے محوِ ناز ہی رہے آئے نہ اس طرف
میں منتظر تو جی سے گیا، اُن کا کیا گیا

میں ہوں خاک اُفتادہ جس آزار کا
عشق بھی اُس کا ہے نام اک پیار کا

اک گدا ایسے ذرہ ہے سیلاب بے مہار

غم کشوں کے دیدۂ خوں بار کا
عشق کا مارا ہے کیا جیئے گا میرؔ
حال ہے بدحال اس بیمار کا

جو تو ہی صنم ہم سے بیزار ہو گا
تو جینا ہمیں اپنا دشوار ہو گا
غمِ ہجر رکھے گا بے تاب دل کو
ہمیں کڑھتے کڑھتے کچھ آزار ہو گا
اُچٹتی ملاقات کب تک رہے گی
کبھی تو تہِ دل سے بھی یار ہو گا

دیر بد عہد وہ جو یار آیا
دُور سے دیکھتے ہی پیار آیا
بے قراری نے مار رکھا ہمیں
اب تو تیرے تئیں قرار آیا
موسم آیا تو نخلِ دار میں میرؔ
سرِ منصور ہی کا بار آیا

زمانہ ہجر کا آسان کیا بسر آیا
ہزار مرتبہ مُنھ کو مرے جگر آیا

نثار کیا کریں ہم خانماں خراب اسیر
کہ گھر لٹا چکے جب یار اپنے گھر آیا

ہو کوئی اُس بے وفا دلدار سے کیا آشنا
آشنا رہ برسوں جو اک دم میں ہو نا آشنا
قدر جانو کچھ ہماری ورنہ پچھتاؤ گے تم
پھر نہیں ملنے کا تم کو کوئی ہم سا آشنا

گئے تھے سیرِ چمن کو اُٹھ کر گلوں میں ٹک جی لگا نہ اپنا
تلاش جوشِ بہار میں کی نگار گلشن میں تھا نہ اپنا
ملا تو تھا وہ بخواہشِ دل مزا بھی پاتے ملے سے لیکن
پھریں جو مستی میں اُس کی آنکھیں سو ہوش ہم کو رہا نہ اپنا
جہاں کا دریائے بے کراں تو سراب پایانِ کار نکلا
جو لوگ تہ سے کچھ آشنا تھے اُنھوں نے لب تر کیا نہ اپنا
نہ ہوش ہم کو نہ صبر دل کو نہ شور سر میں نہ زور پا میں
جو روویں کس کس کو روویں اب ہم وفا میں کیا کیا گیا نہ اپنا
جہاں میں رہنے کو جی بہت تھا نہ کر سکے میر کچھ توقف

بنا تھی نا پائدار اس کی اسی سے رہنا بنا نہ اپنا

یہ چمک یا قوت کی چلتی ہے اتنی دور کا ہیکو
اچنبھا ہے نظر بازوں کو اُن ہونٹوں کی لالی کا
دماغ اپنا تو اپنی فکر میں ہی ہو چکا یکسر
خیال اب کس کو ہے اے ہمنشیں نازک خیالی کا
نہ پہنچے جو دعائے میر واں تک تو عجب کیا ہے
علو ہے مرتبہ ازبسکہ اس درگاہِ عالی کا

دل جو ناگاہ بے قرار ہوا — اُس سے کیا جانوں کیا قرار ہوا
بسترِ خواب سے جو اُس کے اٹھا — گلِ تر سوکھ سوکھ خار ہوا
مجھ سے لینے لگے ہیں عبرت لوگ — عاشقی میں یہ اعتبار ہوا
روز و شب روتے کڑھتے گزرے ہے — اب یہی اپنا روزگار ہوا
روؤں کیا اپنی سادگی پہ میر — میں نے جانا کہ مجھ سے یار ہوا

جس ستمدیدہ کو اس عشق کا آزار ہوا
ایک دو دن ہی میں وہ زار و زبوں خوار ہوا

روز بازار میں عالم کے عجب شئی ہے حسن
بک گیا آپ ہی جو اس کا خریدار ہوا
ہو بخود تو کسو کو ڈھونڈھ نکالے کوئی
وہی خود گم ہوا جو اُس کا طلبگار ہوا
کیونکے سب عمر صعوبت میں کٹی تیری میرؔ
اپنا جینا تو کوئی دن ہمیں دشوار ہوا

جو قافلے گئے تھے اُنھوں کی اُٹھی بھی گرد
کیا جانیے غبار ہمارا کہاں رہا
ہے جان تو جہان ہے مشہور ہے مثل
کیا ہے گئے یہ جان کے گو پھر جہاں رہا

ق

سخن مشتاق ہے عالم ہمارا
بہت عالم کرے گا غم ہمارا
پڑھیں گے شعر رو رو لوگ بیٹھے
رہے گا دیر تک ماتم ہمارا
کسو کے بال درہم دیکھتے میرؔ
ہوا ہے کام دل برہم ہمارا

ردیف : ب

جھپکی ہیں آنکھیں اور جھکی آتی ہیں بہت
نزدیک شاید آیا ہے ہنگامِ خواب اب

تجرید کا فراغ ہے اک دولتِ عظیم
بھاگا جو اپنے سائے سے، ہے خوش تر آفتاب
پیدا ہے روز شرقِ نو کی نمود سے
نکلے ہے کوئے یار سے بچ بچ کر آفتاب
روشن ہے یہ کہ خوف ہے اُس غصہ ور کا میر
نکلے ہے صبح کانپتا جو تھر تھرا آفتاب

کیا کوئی یاری کسو سے کر کے ہووے شاد کام
دوستی ہے دشمنی، اُلفت نہیں کلفت ہے اب

دیکھنا منھ یار کا اس وجہ سے ہوتا نہیں

یا الٰہی دے زمانے سے اُٹھا رسمِ نقاب

ردیف: ت

جو کوئی اُس بے وفا سے دل لگاتا ہے بہت
وہ ستمگر اُس ستمکش کو ستاتا ہے بہت

منھ پہ رکھتا ہے وہ نقاب بہت
ہم سے کرتا ہے وہ حجاب بہت
چشمکِ گل کا لطف بھی نہ اُٹھا
کم رہا موسمِ شباب بہت
دیر بھی کچھ لگی نہ مرتے ہمیں
عمر جاتی رہی شتاب بہت
دیر تک کعبے میں تھے شب بیہوش
پی گئے میرجی شراب بہت

کیا کہیں ہے حالِ دل درہم بہت
کُڑھتے ہیں دن رات اس پر ہم بہت
اضطراب اس کا نہیں ہوتا ہے کم
ہاتھ بھی رکھتے ہیں دل پر ہم بہت

خشکی لب کی، زردی رُخ کی نمناکی دو آنکھوں کی

جو دیکھے ہے کھے ہے اُن نے کھینچا ہے آزار بہت
جسم کی حالت جی کی طاقت نبض سے کر معلوم طبیب
کہنے لگا جانبر کیا ہو گا' یہ تو ہے بیمار بہت

ردیف چ

لطف جیسے ہیں اُس کی چاہ کے بیچ
رنج ویسے ہی ہیں نباہ کے بیچ
اُس کی چشمِ سیہ ہے وہ جس نے
کتنے جی مارے اک نگاہ کے بیچ

خاکِ تربت کیوں نہ اپنی دلبرانہ اٹھ چلے
ہم بھی تھے اُس نازنیں کے ناز برداروں کے بیچ

ردیف: ر

دل گئے آفت آئی جانوں پر یہ فسانہ رہا زبانوں پر
عشق میں ہوش و صبر سنتے تھے رہ گئے ہاتھ ہو تو کانوں پر
کوئی بولا نہ قتل میں میرے مُہر کی تھی مگر دہانوں پر

برسات اب کے گزری خوف و خطر میں ساری
چشمک زناں رہی ہے برق آشیاں کے اوپر
محوِ دعا تھا اکثر غیرت سے لیک گاہے
آیا نہ نام اُس کا میری زباں کے اوپر

وہ بے وفا نہ آیا بالیں پہ وقتِ رفتن
سو بار ہم نے دیکھا سر کو اُٹھا اُٹھا کر

وہ آنکھ اُٹھا کے شرم سے کب دیکھتا ہے ولے
ہوتے ہیں خون نیچی بھی اُس کی نگاہ پر

ڈر چشمِ شورِ چرخ سے گل پھول اک طرف
آنکھ اُس دنی کی دوڑے ہے اک برگ کاہ پر

میلانِ دلربا ہو کیونکر وفا کے اوپر
دیتا ہے جان عالم اُس کی جفا کے اوپر
کشتہ ہوں اس حیا کا کٹوائے بہتوں کے سر
پھر آنکھیں اُس کی وہ ہیں تھیں پشتِ پا کے اوپر
بندوں سے کام تیرا اے میر کچھ نہ نکلا
موقوف مطلب اپنا اب رکھ خدا کے اوپر

باندھے کمر سحر گہ آیا ہے میرے کیں پر
جو حادثہ فلک سے نازل ہوا زمیں پر
اقرار میں کہاں ہے انکار کی سی خوبی
ہوتا ہے شوق غالب اُس کی نہیں نہیں پر

گل کیا جسے کہیں کہ گلے کا تو ہار کر
ہم پھینک دیں اُسے ترے منھ پر نثار کر

آغوشیں جیسے موجیں اٹھی کشادہ ہیں
دریائے حسن اُس کا کہیں ہم کنار کر
مختار رونے ہنسنے میں تجھکو اگر کریں
تو اختیار گریۂ بے اختیار کر
میں بے قرار خاک میں کب تک ملا کروں
کچھ ملنے یا نہ ملنے کا تو بھی قرار کر
میں میرؔ قصد مجلسِ تصویر کا کیا
تو بیٹھا میرا حشر تک اب انتظار کر

ردیف: ک

ق

جب کہتے تھے تب تم نے تو گوشِ ہوش نہ کھولے ٹک
چپکے چپکے کسو کو چاہا، پوچھا بھی تو نہ بولے ٹک
اب جو چھاتی جلی فی الواقع، لطف نہیں ہے شکایت کا
صبر کرو، کیا ہوتا ہے یوں پھوڑے دل کے پھپھولے ٹک

بہار آئی پر ایک پتی بھی گل کی
نہ آئی اسیرانِ بے بال و پر تک

وہ تو نہیں کہ ادھر رہتا تھا آشیاں تک
آشوبِ نالہ اب تو پہنچا ہے آسماں تک
لبریز جلوہ اُس کا سارا جہاں ہے، یعنی
ساری ہے وہ حقیقت جاوے نظر جہاں تک
واماندۂ نقشِ پا ہے یک دشت ہم ہیں لیکن

دُشوار ہے پہنچنا اب اپنا کاروَاں تک
دل دھڑکے ہے جو بجلی چمکے ہے سوئے گلشن
پہنچے مبادا میرے تا شاخِ آشیاں تک
یہ تنگی و نزاکت اس رنگ سے کہاں ہے
گلبرگ و غنچہ پہنچیں کب اُس لب و دہاں تک

صیاد اسیر کر کے جب سے اُٹھ گیا ہمیشہ
وہ دام کی شکن میں گرفتار کب تک

ردیف:۔ ل

نہ نہار گلستاں میں نہ کر منھ کو سوئے گل
چڑھ جائے مغز میں نہ کہیں گرد بوئے گل
تڑپے خزاں میں اتنے کہ مر مر گئے طیور
جاوے گی ساتھ جی کے مگر آرزوئے گل

طریقِ عشق میں ہے رہنما دل
پیمبر دل ہے، قبلہ دل، خدا دل
دُکا اتنا، خفا اتنا ہوا تھا
کہ آخر خون ہو ہو کر بہا دل
جسے مار اُسے پھر کر نہ دیکھا
ہمارا طرفہ ظالم سے لگا دل
بدن میں اُس کے ہے ہر جائے دلکش
بجا بے جا ہوا ہے جا بجا دل
ہمہ تن میں الم تھا سو نہ جانا

گرہ بہ درد پہلو میں ہے یادِ دل
خموشی مجکو حیرت سے ہے، ورنہ
بھرے ہیں لب سے لے کر شکوے تا دل

ردیف — م

کھا گئی یاں کی فکر سود و ہموم
واں گئے کیا ہو کچھ نہیں معلوم

ہے عبث یہ تردد و تشویش
پہنچے ہے وقت پر جو ہے مقسوم

صاحب اپنا ہے بندہ پرور میر
ہم جہاں سے نہ جاویں گے محروم

عشق کیا ہے اُس گل کا یا آفت لائے سر پہ ہم
جھانکتے اُس کو ساتھ صبا کے صبح پھرے ہیں در در ہم
آہ معیشت رندوں شب کی ساتھ انھوں کے ٹھہری ہے
روتے کڑھتے رہا کرتے ہیں غم سے ہوئے ہیں جھنجھلا کر ہم

گھٹ گھٹ کے جہاں میں پہنچے جب میر سے ہم
تب جا کے یہاں واقف اسرار ہوئے ہم

وے ہم ہیں جن کو کہتے آزار دیدہ مردم
اُلفت گزیدہ مردم کلفت کشیدہ مردم

ہے اپنا جی بھی درہم، تس پر ہے عشق کا غم
رہتے ہیں دم بخود ہم، آفت رسیدہ مردم

وہ دیکھے ہم کو آکر جس نے نہ دیکھے ہوویں
آزردہ، دل شکستہ، خاطر کبیدہ مردم

مت ناک عاشقاں پر چھڑک آبِ زندگی سا
جاگیں کہیں نہ سوتے یہ آرمیدہ مردم

لے لے کے منھ میں تنکا ملتے ہیں عاجزانہ
مغرور سے ہمارے برخویش چیدہ مردم

ردیف :۔ ن

سر سے ایسی ہے لگی اب کہ جلے جاتے ہیں
متصل شمع سے رونے ہیں گلے جاتے ہیں
اس گلستاں میں نمود اپنی ہے جوں آبِ رواں
دمبدم مرتبے سے اپنے چلے جاتے ہیں

مر گئے نامراد ہم مجبور خواہشیں جی کی اپنے جی میں رہیں

رابطہ باہم ہے کوئی دن کا یاں پھر زمانے میں کہاں تم ہم کہاں
تو کہے واں ناگہاں بجلی گری وہ نگاہِ تند کرتا ہے جہاں
بھولے بھی میں اک نظر دیکھا نہیں ترس یہ ہے وہ بے دماغ و بدگماں
کیا چھپی ہیں باتیں میرے عشق کی داستاں در داستاں ہے داستاں

اُس سے گھبرا کے جو کچھ کہنے کو آ جاتا ہوں
دل کی پھر دل میں لیے چُپکا چلا جاتا ہوں

گرچہ کھویا سا گیا ہوں پہ تہِ حرف و سخن
اُس فریبندۂ عشاق کی پا جاتا ہوں
یک بیاباں ہے مری بے کسی و تنہائی
مثلِ آوازِ جرس سب سے جدا جاتا ہوں

مجلسِ یار میں تو بار نہیں پاتا ہوں
در و دیوار کو احوال سُنا جاتا ہوں

نہ سمجھو مجھے بے خبر اس قدر
نہ دل سے لوگوں کی آگاہ ہوں

بہار آئی مزاجوں کی سبھی تدبیر کرتے ہیں
دوانوں کو انھیں ایام میں زنجیر کرتے ہیں
در و دیوارِ اُفتادہ کو بھی کاش اک نظر دیکھیں
عمارت ساز مردم گھر جو اب تعمیر کرتے ہیں

طلب ہے کامِ دل کی اُس کے بالوں کی اسیری میں

گدائی رات کو کرتا ہوں خجلت سے فقیری میں
نظیر اُس کی نظر آئی نہ سیاحانِ عالم کو
سیاحت دُور تک کی، ایک ہے وہ بے نظیری میں

اب دیکھیں آہ کیا ہو ہم وے جدا ہوئے ہیں
بے یار و بے دیار و بے آشنا ہوئے ہیں
غیرت سے نام اُس کا آیا نہیں زباں پر
آگے خدا کے جب ہم محوِ دُعا ہوئے ہیں
اہلِ چمن سے کیونکر اپنی ہو رُو شناسی
برسوں اسیر رہ کر اب ہم رہا ہوئے ہیں

میں منھ نہیں لگایا بنتُ العنب کو گاہے
تب تھا جوانِ صالح، اب پیرِ میکدہ ہوں

اسرارِ دل کے کہتے ہیں پیر و جوان میں
مطلق نہیں ہے بند ہماری زبان میں
رنگینیٔ زمانہ سے خاطر نہ جمع رکھ

سو رنگ بدلے جاتے ہیں یاں ایک آن میں
شاید بہار آئی ہے دیوانہ ہے جہاں
زنجیر کی سی آتی ہے جھنکار کان میں
تارے ہے تو یہ نہیں مری آہوں سے رات کی
سوراخ پڑ گئے ہیں تمام آسمان میں

آئے ہیں میر کافر ہو کر خدا کے گھر میں
پیشانی پر ہے قشقہ زنّار ہے کمر میں
سیرت سے گفتگو ہے کیا معتبر ہے صورت
ہے ایک سوکھی لکڑی جو بو نہ ہو اگر میں
اب صبح و شام شاید گریے پہ رنگ آوے
رہتا ہے کچھ جھمکتا خوناب چشمِ تر میں
عالم میں آب و گل کے کیونکر نباہ ہو گا
اسباب گر پڑا ہے سارا مرا سفر میں

آنکھ لگی ہے جب سے اُس سے آنکھ لگی زنہار نہیں
نیند آتی ہے دل جمعی میں سو تو دل کو قرار نہیں

خالی پڑے ہیں دام وکمیں، یا صیدِ وحشی صید ہوئے
یا جس صید افگن کے لئے تھے اُس کو ذوقِ شکار نہیں

طرفہ خوش رُو دمِ خونریز ادا کرتے ہیں
وار جب کرتے ہیں مُنھ پھیر لیا کرتے ہیں
عشق کرنا نہیں آسان بہت مشکل ہے
چھاتی پتھر کی ہے اُن کی جو وفا کرتے ہیں
واں سے یک حرف و حکایت بھی نہ لایا کوئی
یاں سے طومار کے طومار چلا کرتے ہیں

ناآشنا کے اپنے جیسے ہم آشنا ہیں
اس طور اس طرح کے ایسے کم آشنا ہیں
باہم جو یاریاں ہیں اور آشنائیاں ہیں
سب ہیں نظر میں اپنی ہم عالم آشنا ہیں
یاری جتانیوں کی کیا میرؔ معتبر ہے
ناآشنا ہیں اکدم یہ اکدم آشنا ہیں

کیا جنوں ہے تم کو جو تم طالبِ ویرانہ ہو
جس کو فردوسِ بریں کہتے ہیں واں آدم کہاں

گر روزگار ہے یہی ہجرانِ یار میں
تو کیا رہیں گے جیتے ہم اس روزگار میں
کچھ ڈر نہیں جو داغِ جنوں ہو گئے سیاہ
ڈر دل کے التہاب کا ہے اس بہار میں
کیا بے قرار دل کی تسلی کرے کوئی
کچھ بھی ثبات ہے ترے عہد و قرار میں
مربوط کیسے کیسے کہے ریختے ولے
سمجھا نہ کوئی میری زباں اس دیار میں
دُنبالہ گردی قیس نے بہتیری کی ولے
آیا نظر نہ محملِ لیلیٰ غبار میں
منھ چاہیے جو کوئی کسو سے حساب لے
ناکس سے گفتگو نہیں روزِ شمار میں
گنتی کے لوگوں کی واں صف ہووے گی کھڑی
تو میر کس شمار میں ہے کس قطار میں

گو کہ بُت خانے جا رہا ہوں میں
بخدا با خدا رہا ہوں میں

سب گئے دل دماغ، تاب و تواں
میں رہا ہوں سو کیا رہا ہوں میں

اُس کی بیگانہ وضعی ہے معلوم
برسوں تک آشنا رہا ہوں میں

دیکھو کب تیغ اُس کی آ بیٹھے
دیر سے سر جُھکا رہا ہوں میں

کچھ رہا ہی نہیں ہے مجھ میں میرؔ
جب سے اُس سے جُدا رہا ہوں میں

ردیف :۔ و

کھُلی رہتی ہے چشم آئینہ ساں کہاں خواب مشتاقِ دیدار کو
مجھے عشق اُس پاس یوں لے گیا کوئی جیسے لاوے گنہگار کو
مرے مُنھ پہ رکھتا ہے مژگاں تلک ہزار آفریں چشمِ خونبار کو

کن نے کہا کہ مجھ سے بہت کم ملا کرو
منّت بھی میں کروں تو نہ ہرگز مَنا کرو
ہم بے خودانِ مجلسِ تصویر اب گئے
تم بیٹھے انتظار ہمارا کیا کرو
جی مارتے ہیں ناز و کرشمہ بالاتفاق
جینا جو میرا چاہو تو ان کو جدا کرو
دل جانے کا فسانہ زبانوں پہ رہ گیا
اب بیٹھے دُور سے یہ کہانی سُنا کرو
میں نے کہا کہ پُھنک رہی ہے تن بدن میں آگ
بُولا کہ عشق ہی میں پڑے اب جلا کرو

اب دیکھوں اُس کو میں تو مرا جی نہ چل پڑے
تم ہو فقیر میر کبھو یہ دُعا کرو

کہنی کے نیچے ہاتھ کے رکھتا دلِ بے تاب کو
وہ چوٹّا لے گیا آسودگیِ خواب کو
کم نہیں ہے سحر سے یہ بھی تصرف عشق کا
پانی کر آنکھوں میں لایا دل کے خونِ ناب کو
چاہتا ہے جب مسبّب آپ ہی ہوتا ہے سبب
دخل اس عالم میں کیا ہے عالمِ اسباب کو
دم بخود رہتا ہوں اکثر سر رکھے زانو پہ میر
حال کہہ کر کیا کروں آزردہ اور احباب کو

زندگی کرتے ہیں مرنے کے لیے اہلِ جہاں
میر ہے واقعہ درپیش عجب یاروں کو

چھوڑ جنوں کے دَور میں رسم و رہِ اسلام کو
تہ کر صنم خانے چلا ہوں جامۂ احرام کو

مرتا مرو جیتا جیو، آڈ کوئی جاؤ کوئی
ہے کام ہم لوگوں سے کیا اُس دلبرِ خود کام کو
بے چین بستر پر رہا، بے خواب خاکستر پہ یوں
صبر و سکوں جب سے گئے پاتا نہیں آرام کو
آسائش و راحت سے جو پوچھے کوئی تو کیا کہوں
مَیں عمر بھر کھینچا کیا رنج و غم و آلام کو
میرؔ اب بھلا کیا ابتدائے عشق کو روتا ہے تو
کر فکر جو پاوے بھی اس آغاز کے انجام کو

زندگی کرتے ہیں مرنے کے لیے اہلِ جہاں
واقعہ میرؔ ہے درپیش عجب یاروں کو

ہاتھ بے سُبحہ ٹک رہا نہ کبھو
دل کا مُنکا وے بھرا نہ کبھو
روز دفتر لکھے گئے یاں سے
اُن نے اک حرف بھی لکھا نہ کبھو
گو شگفتہ چمن چمن تھے گل
غنچۂ دل تو وا ہوا نہ کبھو
غیرت اپنی تھی یہ کہ بعدِ نماز
اُس کالے نام کی دعا نہ کبھو
ابتدا ہی میں مر گئے سب یار
عشق کی پائی انتہا نہ کبھو

ٹک نقاب اُلٹو مت عتاب کرو — کھولو مُنھ کو تو پھر خطاب کرو
آنکھیں غُصّے میں ہو گئی ہیں لال — سر کو چھاتی پہ رکھ کے خواب کرو
فرصتِ بود و باش یاں کم ہے — کام جو کچھ کرو شتاب کرو
جھوٹ اُس کا نشان نہ دو یارو — ہم خرابوں کو مت خراب کرو
مُنھ کھُلے اُس کے چاندنی چھٹکی — دوستو سیرِ ماہتاب کرو
میرؔ جی رازِ عشق ہو گا فاش — چشم ہر لحظہ مت پُر آب کرو

بس اب بن چکی رودِ موئے سمن بو
گری ہو کے بے ہوش مشاطہ یکسو
نہ سمجھا گیا کھیل قدرت کا ہم سے
کیا اُس کو بد خُو بنا کر نکو رُو
بہار آئی گُل پھُول سر جوڑے نکلے
رہیں باغ میں کاش اس رنگ ہم تو
رہے آبرو میرؔ تو ہے غنیمت
کہ غارت میں دل کی ہے ایمائے ابرو

جدھر پھرنے تھے چُنتے پھُول ہنستے

اُدھر ٹپکے ہیں اب تک میرے آنسو

چاہت میں خوبرویوں کی کیا جانے کیا نہ ہو
بے تاب دل کا مرگ کہیں مدعا نہ ہو
کرتے دُعا مجھے وہ دغاباز دیکھ کر
بولا کہ اس فقیر کے دل میں دغا نہ ہو
آزادِ پرشکستہ کو صد رنگ قید ہے
یارب اسیر ایسا قفس سے رہا نہ ہو
رہتے ہیں میرؔ بےخود و وارفتہ ان دنوں
پوچھو کنایۃً کسو سے دل لگا نہ ہو

ردیف:- ہ

ہر چند جذبِ عشق سے تشریف یاں بھی لائے وہ
پر خود گم ایسا میں نہیں جو سہل مجھکو پائے وہ
خوبی و رعنائی اُدھر بدحالی و خواری اِدھر
اے وائے ہم اے وائے ہم اے ہائے وہ اے ہائے وہ
عاشق کا کتنا حوصلہ یہ معجزہ ہے عشق کا
جو خستہ جاں بارہ جگر سو داغ دل پر کھائے وہ
مشکل عجائب میر ہے دیدار جوئی یار کی
دیکھے کنکھیوں غصہ ہو آنکھیں لڑے شرمائے وہ

اے کاش فصلِ گُل میں گئی ہوتی اپنی جان
مل جاتی کوئی دن یہ ہوا اُس ہوا کے ساتھ
کیفیت آشنا نہیں اُس مستِ ناز کے
معشوق ورنہ کون ہے اب اس ادا کے ساتھ
مُنھ اپنا اُن نے عکس سے اپنے چھپا لیا

دیکھا نہ کوئی آئینہ رُو اس حیا کے ساتھ

لُکنت سے کیا نکلتی نہیں اُس کے مُنھ سے بات
چپکا ہے حرف یار کے شیریں دہن کے ساتھ

نظر آیا تھا صبح دُور سے وہ پر چھپا خور سا اپنے نور سے وہ
خوش ہیں دیوانگیٔ میرؔ سے سب کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ

آزارکش کو اُس کے آزار ہے ہمیشہ
آزردہ دل کسو کا بیمار ہے ہمیشہ
پروائے نفع و نقصاں مطلق نہیں ہے اُس کو
اُس کی تو لااُبالی سرکار ہے ہمیشہ
ملنا نہ ملنا ٹھہرے تو دل بھی اپنا ٹھہرے
اقرار ہے ہمیشہ انکار ہے ہمیشہ
عالم کا عین اُسی کو معلوم کر چکے ہیں
اس وجہ سے اب اُس کا دیدار ہے ہمیشہ

دل ہے میری بغل میں صد پارہ
اور ہر پارہ اُس کا آوارہ

عَرَقِ شرمِ روئے دلبر سے
رفتہ ثابت، گزشتہ سیارہ

خواری عشق اپنی عزت ہے
کی ہے ہموار راہِ ہموارہ

ٹوٹتیں پھوٹتیں نہ کاش آنکھیں
انکھیں رخنوں سے کرتے نظارہ

گو مسیحا مزاج آوے طبیب
عشق میں مرگ بن نہیں چارہ

کیا بنے اُس سے میرؔ میں سکیں
وہ جفا پیشہ و ستم کارہ

مکتوب دیر بھیجا ہر دو طرف سے سادہ
کیا شوخ طبع ہے وہ پُر کار سادہ سادہ

مت دم کشی کر اتنی ہنگامِ صبح بلبل
فریاد خونچکاں ہے مُنھ سے ترے زیادہ

حالاتِ عشق و رنج و درد و بلا مصیبت
دل دادہ میرؔ جانے کیا جانے دل ندادہ

ردیف : ی

کہتے ہیں مرنے والے یاں سے گئے
سب یہیں رہ گئے، کہاں سے گئے
دم میں دم جب تک تھا سوچ رہا
سانس کے ساتھ سارے سانسے گئے

صُبح تک رات کو کراہا ہے
شدہ خبر اپنے غمزدے کی لے

عشق میں ہم نے جاں کنی کی ہے
کیا محبت نے دُشمنی کی ہے
کیسی سُرخ و سفید نکلی تھی
مَیٔ تگرُدختر ارمنی کی ہے
قافلہ لُٹ گیا جو اشکوں کا
عشق نے میرؔ رہزنی کی ہے

صید کے تن پہ ہاں سب گھائے زخم
کس قدر خوش کار اُس کا تیر ہے
خط نہ لکھتے تھے سو تابِ دل گئی

دفتروں کی اکثر اب تحریر ہے

بال و پر بھی گئے بہار کے ساتھ
اب توقع نہیں رہائی کی

اک نگہ میں ہزار جی مارے
ساحری کی کہ دل رُبائی کی

نسبت اُس آستاں سے کچھ نہ ہوئی
برسوں تک ہم نے جبہہ سائی کی

وصل کے دن کو کارِ جاں کھینچا
شب نہ آخر ہوئی جُدائی کی

زمیں اَور ہے آسماں اَور ہے
کہ آناً فآناً سماں اور ہے

نہ ان لوگوں کی بات سمجھی گئی
یہ خلق اَور اُس کی زباں اور ہے

ہوا رنگ بدلے ہے ہر آن میرؔ
زمین و زماں ہر زماں اور ہے

کہو تو کب تئیں یوں ساتھ تیرے پیار رہے
کہ دیکھا جب تجھے تب جی کو مار مار رہے

ہم آپ سے جو گئے ہیں، گئے ہیں مدت سے
الٰہی اپنا ہمیں کب تک انتظار رہے

ہوس اسیروں کے بھی دل کی نکلے ٹک شاید
کوئی دن اَور اگر موسمِ بہار رہے

اُٹھا جو باغ سے میں بے دماغ تو نہ پھرا
ہزار مرغِ گلستاں مجھے پکار رہے
نہ کر سکے گریۂ بے اختیار ہرگز میرؔ
جو عشق کرنے میں دل پر کچھ اختیار رہے

جس آنکھ سے دیا تھا اُن نے فریب دل کو
اُس آنکھ کو جو دیکھو اب آشنا نہیں ہے

جو لوگ چلتے پھرتے یاں چھوڑ کر گئے تھے
دیکھا نہ اُن کو ایک آتے جو ہم سفر سے
سر دے دے مارتے ہیں ہجراں میں میرؔ صاحب
یارب چھُڑا تو ان کو چاہت کے دردِ سر سے

جب سے جہاں ہے تب سے خرابی یہی ہے میرؔ
تم دیکھ کر زمانے کو حیران کیا رہے

وہ اب ہوا ہے اتنا کہ جور و جفا کرے

افسوس ہے جو عمر نہ میری وفا کرے
ہجرانِ یار ایک مصیبت ہے ہمنشیں
مرنے کے حال سے کوئی کب تک جیا کرے
مستی شراب کی ہی سی ہے آمدِ شباب
ایسا نہ ہو کہ تم کو جوانی نشا کرے
یارب نسیمِ لُطف سے تیرے کہیں کھلے
دل اس چمن میں غُنچہ سا کب تک رہا کرے
برسوں کیا کرے مری تربت کو گُل فشاں
مرغِ چمن اگر حقِ صحبت ادا کرے

مُدّت سے تو دلوں کی ملاقات بھی گئی
ظاہر کا پاس تھا سو مدارات بھی گئی
پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزّتِ سادات بھی گئی

ق
گُل نے بہت کہا کہ چمن سے نہ جائیے

گلگشت کو جو آئے ہیں آنکھوں پہ آئیے
مَیں بے دماغ کرکے تغافل چلا گیا
وہ دل کہاں کہ ناز کسو کے اُٹھائیے
صحبت عجب طرح کی پڑی اتّفاق ہائے
کھو بیٹھیے جو آپ کو تو اُس کو پائیے
خاطر ہی کے علاقے کی سب ہیں خرابیاں
اپنا ہو بس تو دل نہ کسو سے لگائیے
اتنی بھی کیا ہے دیدہ درائی کہ غیر سے
آنکھیں لڑائیے، ہمیں آنکھیں دکھائیے
جانِ غیور پر ہے ستم سا ستم کہ میرؔ
بگڑا جنھوں سے چاہیے اُن سے بنائیے

دل میں مُسَوَّدے تھے بہت پر حضورِ یار
نکلا نہ ایک حرف بھی میری زبان سے

کہو سو کریے علاج اپنا تپیدنِ دل بلائے جاں ہے
نہ شب کو مہلت نہ دن کو فرصت دمادم آنکھوں سے خوں رواں ہے

کڑھا کرے ہیں ہوا ہے مورد جہانِ اجسام جب سے اپنا
غمِ جدائی جہانِ جاں کا ہمارے دل میں جہاں جہاں ہے

سرِ راہ چند انتظاری رہے
بھلا کب تلک بے قراری رہے

کیا منہ لگے گلوں کے شگفتہ دماغ ہے
بھولا بھرے ہے مرغِ چمن باغ باغ ہے
وہ دل نہیں رہا ہے نہ اب وہ دماغ ہے
جی تن میں اپنے بجھتا سا کوئی چراغ ہے
صولت فقیری کی نہ گئی مر گئے پہ بھی
اب چشمِ شیرِ گور کا میری چراغ ہے
مدت ہوئی کہ زانو سے اٹھتا نہیں ہے سر
کڑھنے سے رات دن کے ہمیں کب فراغ ہے

طبیعت نے عجب کل یہ ادا کی
کہ ساری رات وحشت ہی رہا کی
ہوا طالع جہاں خورشید دن ہے
تردد کیا ہے ہستی میں خدا کی

ہم رو رو کے دردِ دلِ دیوانہ کہیں گے
جی میں ہے کبھو حالِ غریبانہ کہیں گے
سودائی و رسوا و شکستہ دل و خستہ
اب لوگ ہمیں عشق میں کیا کیا نہ کہیں گے
موقوف غمِ میرؔ کہ شب ہو چکی ہمدم
کل رات کو پھر باقی یہ افسانہ کہیں گے

جام گلوں کے خزاں میں نگوں ہیں نکہتِ خوش بھی چمن سے گئی
ئی شاید کہ تمام ہوئی ہے ہر غنچے کی گلابی کی
عشقِ میرؔ کسو سے اتنا اب تک ظاہر ہم پہ نہ تھا
حرفِ یار جو مُنھ سے نکلا اُن نے بلا بیتابی کی

اب یہ حسرت رہے گی مرنے تک
موسمِ گل میں ہم اسیر ہوئے
ہے شرارت کا وقت عہدِ شباب
تم لڑکپن ہی میں شریر ہوئے
گھر کو اُس کے خراب ہی دیکھا
جس کے یہ دیدہ و دل مشیر ہوئے
یاں کی خلقت کی ہے زباں اُلٹی
کہتے ہیں اندھوں کو بصیر ہوئے
نہ ہوئے ہم نظیری سے یوں تو
شعر کے فن میں بے نظیر ہوئے

آؤ کبھو تو پاس ہمارے بھی ناز سے
کرنا سلوک خوب ہے اہلِ نیاز سے
شاید شراب خانے میں شب کو رہے تھے میر
کھیلے تھا ایک مغبچہ مہرِ نماز سے

تم کرو شاد زندگی کہ مجھے — دل کے خوں ہونے کا بہت غم ہے
جب سے عالم میں جلوہ گر ہے تو — تہلکے ہیں تمام عالم ہے
کچھ تو نسبت ہے اُس کے بالوں سے — یوں ہی کیا حالِ میر درہم ہے

جو لوگ آسماں نے یاں خاک کر اُڑائے
بے عبرتوں نے لے کر خاک اُن کی گھر بنائے
پامال لوگ کیا کیا آگے ہوئے ہیں تم سے
اس پر بھی تم جو آئے یاں تم نے سر اُٹھائے
کیا گھورتے ہو ہمدم ڈرتے نہیں ہیں کچھ ہم
جن آنکھوں کے ہیں عاشق اُن آنکھوں نے دکھائے

اے خوشا حال اُس کا جس کا وے — حال عمداً تباہ کرتے تھے

نیچی آنکھیں ہم اُس کو دیکھا کیے　　کبھو اونچی نگاہ کرتے تھے
کیا زمانہ تھا وہ جو گزرا میرؔ　　ہم دگر لوگ چاہ کرتے تھے

اب کی زُلفوں سے دل بچا تو کیا　　چُور جاتے رہے کہ اندھیاری
چلے جاتے ہیں رات دن آنسو　　دیدۂ تر کی خیر ہے جاری
واں سے ختم خطاب ناز و عتاب　　یاں سے اخلاص، دوستی، یاری

بات واعظ کی مؤثر ہو دلوں میں کیونکر
دن کو طامات رہے شب کو مناجات رہے

رہتا نہیں ہے رکتے، تھمتا نہیں ہے تھامے
یہ دل تڑپ تڑپ کر اب ظلم کر رہا ہے

کیا طرح ہے یاں جو آتے ہو تو شرماتے ہوئے
بات مُنھی کہتے ہو غُصّے سے جھنجلاتے ہوئے
دشمنی سے سایۂ عاشق کو جو مارے ہے تیر
اُس کماں ابرو کے جا کر میرؔ ہمسائے ہوئے

چرخ پہ اپنا مدار، دیکھیے کب تک رہے
ایسی طرح روزگار، دیکھیے کب تک رہے
سہرے کہاں تک پڑیں آنسوؤں کے چہرے پہ
گریہ گلے ہی کا ہار، دیکھیے کب تک رہے
اُس سے تو عہد و قرار کچھ بھی نہیں درمیاں
دل ہے مرا بے قرار، دیکھیے کب تک رہے
روئے سخن سب کا ہے میری غزل کی طرف
شعر ہے میرا شعار، دیکھیے کب تک رہے

بہت نامہرباں رہتا ہے، یعنی ہمارے حال پر کچھ مہرباں ہے
ہمیں جس جا پہ کل غش آ گیا تھا وہیں شاید کہ اُس کا آستاں ہے

ہم رہنِ بادہ جامۂ احرام کر چکے مستی کی دیر میں قسم اقسام کر چکے

عشق کیا کوئی اختیار کرے وہی جی مارے جس کو پیار کرے
کبھی سہیے پہ جفا کوئی کب تک جھوٹے وعدوں کا اعتبار کرے

سب کام سونپ اُس کو جو کچھ کام بھی چلے
جپ نام اُس کا صُبح کو، تا نام بھی چلے
یہ راہِ دورِ عشق نہیں ہوتی میرؔ طے
ہم صُبح بھی چلے گئے ہیں، شام بھی چلے

پڑتا ہے پھُول برق سے گلزار کی طرف
دھڑکے ہے جی قفس میں غمِ آشیاں سے
یکدست جوں صدائے جرس بیکسی کے ساتھ
مَیں ہر طرف گیا ہوں جُدا کارواں سے
دیں گالیاں اُنھوں نے، وہ بے دماغ ہیں
مَیں میرؔ کچھ کہا نہیں اپنی زباں سے

گلبرگ سی زباں سے بلبل نے کیا فغاں کی
سب جیسے اُڑ گئی ہے رنگینی گلستاں کی
صوم و صلوٰۃ یکسو میخانے میں جو ہم تھے
آواز بھی نہ آئی کانوں میں یاں اذاں کی

"انتخاب اشعار غزلیات مثنویات"

پہنچی قریب شاید نخچیر گاہ اُس کی
جوں صیدِ خوں گرفتہ دل بے قرار ہے تُو
یاں دو قدم بھی چلنا بے سر دیے نہ ہووے
اے راہِ عشق کتنی مشکل گزار ہے تُو
لیتا ہے تجھ سے عبرت جو کوئی دیکھتا ہے
کیا میرؔ اُس گلی میں بے اختیار ہے تُو

یہی انداز باندھے ہیں یہی ناز   قیامت میرؔ صاحب ہیں یا دابند

سبزہ ہے آبجو ہے فصلِ بہار بھی ہے
سر گرمِ جلوہ دیکھو پہلو میں یار بھی ہے
یہ تو نہیں کہ ہم پر ہر دم ہے بے دماغی
آنکھیں دکھاتے ہیں تو چتون میں پیار بھی ہے
گُل ہمکنار ہوگا سخن کر کبھو جو [illegible]

بر کم بغل ہے بلبل اس کو قرار بھی ہے؟
ہوں وعدہ گاہ میں تو پر میں ہی جانتا ہوں
کچھ اضطراب بھی ہے کچھ انتظار بھی ہے
جُوں موج ہم بغل ہوں نایاب اُس گُہر سے
دریا کی سیر بھی ہے بوس و کنار بھی ہے

مہر و وفا و اُلفت کرتے تھے لوگ باہم
رحمت خدا کی، تم نے اس رسم کو اُٹھایا

لطفِ سخن بھی پیری میں رہتا نہیں ہے میرؔ
اب شعر ہم پڑھے ہیں تو وہ شد و مد نہیں

محوِ سخن ہم فکرِ سخن میں رفتہ ہی بیٹھے رہتے ہیں
آپ کو جب کھویا ہے ہم نے تب یہ گوہر پاتے ہیں

آشفتہ سر ہیں سرد، گریباں دریدہ گُل
بیٹھا کہاں چمن میں کہ فتنہ اُٹھا گیا

نہ دماغ ہے کہ کسو سے ہم کریں گفتگو غمِ یار میں
نہ فراغ ہے کہ فقیروں سے ملیں جا کے دِلّی دیار میں

نہ چمن میں جاتے رہا ہے دل نہ جنوں میں پھرتے لگا ہے دل
وہی بے کلی رہی جان کو رہے سیر میں کہ شکار میں

کہے کون صیدِ رمیدہ سے کہ ادھر بھی پھر کے نظر کرے
کہ نقاب اُلٹے سوار ہے ترے پیچھے کوئی غبار میں

جُھکی کچھ کہ جی میں جُھبی سبھی، ہلی ٹک کہ دل میں کھُبی سبھی
یہ جو لاگ پلکوں میں اُس کی ہے نہ چُھری میں ہے نہ کٹار میں

عشق میں اے ہمرہاں کچھ تو کیا چاہیے
گریہ و شور و فغاں کچھ تو کیا چاہیے

ہاتھ رکھے ہاتھ پر بیٹھے ہو کیا بے خبر
چلنے کو ہے کارواں کچھ تو کیا چاہیے

کیا کروں دل خوں کروں شعر ہی موزوں کروں
چلتی ہے اب تک زباں کچھ تو کیا چاہیے

ہو نہ سکے گر نماز دل کی طرف کر نیاز
وقت گیا پھر کہاں کچھ تو کیا چاہیے

میرؔ نہیں پیر تم، کاہلی اللہ رے
نامِ خدا ہو جوان کچھ تو کیا چاہیے

کوئی فصلِ گُل میں بھی توبہ کرے ہے
رہے گی ہمیں دیر اس کی ندامت

قربان پیالۂ مئے ناب   جس سے کہ ترا حجاب نکلا

کر دو تمام کہ حال ہم میں رہا نہیں ہے غموں کے مارے
جو کچھ بھروسا اُنھوں پہ تھا سو شکیب و تاب و تواں سدھارے

کہتے تھے یہ ہم نہ کر تمنا   اے جانِ اُمیدوار دیکھا
آنکھوں سے اُٹھا بڑا آبلوں کی   صحرا میں جدھر کو خار دیکھا

کس طور تو نے باغ میں آنکھوں کے تئیں ملا
نرگس کا جس سے رنگِ شکستہ بھی اُڑ چلا

انتخاب فردیات

مَے گلگوں کی بُو سے بسکہ میخانہ مہکتا تھا
لبِ ساغر پہ مُنہ رکھو رکھے ہر شیشہ بہکتا تھا

جب کہ تابوت مرا جائے شہادت سے اُٹھا
شُعلۂ آہ دلِ گرمِ محبت سے اُٹھا

یک پارہ جیب کا بھی بجا میں نہیں سیا
وحشت میں جو سیا سو کہیں کا کہیں سیا

اُٹھوں نہ خاک سے کُشتہ میں کم نگاہی کا
دماغ کس کو ہے محشر کی داد خواہی کا

دل گیا رُسوا ہوئے آخر کو سودا ہو گیا
اس دو روزہ زیست میں ہم پہ بھی کیا کیا ہو گیا

کس طور تو نے باغ میں آنکھوں کے تئیں بلا
نرگس کا جس سے رنگِ شکستہ بھی اڑ چلا

وعدے ہر روز رہے اور تم آتے ہی رہے
ہم کو دیکھو کہ لگے چلنے تو جاتے ہی رہے

مہیا جس کئے اسباب ملکی اور مالی تھے
وہ اسکندر گیا یاں سے تو دونوں ہاتھ خالی تھے

کھا کے دانہ یہ دام چھوایا ہو وے آدم کو بھی بہشت نصیب

تری زلفِ سیہ کی یاد میں آنسو جھمکتے ہیں
اندھیری رات ہے برسات ہے جگنو چمکتے ہیں

جیسے نسیم ہر سحر تیری کروں ہوں جستجو
خانہ بخانہ، در بدر، شہر بشہر، کو بکو

نہ رہ دُنیا میں دلجمعی سے جو انسان دانا ہے
سفر کا بھی رہے خطرہ کہ اس منزل سے جانا ہے

مُدت ہوئی کہ تاب و تواں جی چھپا گئے
بیتاب کر کے خاک میں ہم کو مِلا گئے
وے دن گئے کہ آٹھ پہر اُس کے پاس تھے
اب آ گئے تو دُور سے کچھ غم سُنا گئے

خاک سے میر کیوں نہ یکساں ہوں   مجھ پہ تو آسمان ٹوٹا ہے

سوائے سنگدلی اور کچھ ہنر بھی ہے
بتاں دلوں میں تمھارے خدا کا ڈر بھی ہے؟

عمر گزری کہ ترے کوچے کے آنے سے گئے
دُور سے ایک نظر دیکھ کے جانے سے گئے

کیوں گردنِ ہلال ابھی سے ڈھلک چلی

ابرو تو اک طرف پلک اُس کی نہیں ہلی

فردوس سے کچھ اُس کی گلی میں کمی نہیں
پر ساکنوں میں واں کے کوئی آدمی نہیں

نسبتِ مہ ہے دُور اُس گُل سے
یہ شگفتہ ہے وہ گرفتہ ہے

لائق نہیں تمھاری مژگاں کے خوش نگاہاں
مجروح دل کو میرے کانٹوں میں مت گھسیٹو

اُن نے دیکھا جو اُٹھ کے سوتے سے
اُڑ گئے آئنے کے توتے سے

دیکھتا ہوں تو کام میرا میرؔ — اوّلِ عشق ہی میں آخر ہے

مشہور رہیں عالم میں تو کیا، ہیں بھی کہیں ہم

القصہ نہ در پے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

نہ اسکندر نہ دارا ہے نہ کسریٰ ہے نہ قیصر ہے
یہ بیت المالِ ملکِ بے وفا بے وارثا گھر ہے

رباعیات

دامن عُزلت کا اب لیا ہے ہم نے
دل مرگ سے آشنا کیا ہے ہم نے
تھا چشمۂ آبِ زندگانی نزدیک
پر خاک سے اُس کو بھر دیا ہے ہم نے

کیسا احساں ہے خلقِ عالم کرنا
پھر عالمِ ہستی میں مکرّم کرنا
تھا تیرا کرم یہ اے کریمِ مطلق
ناچیز کفِ خاک کو آدم کرنا

بُت خانے سے دل اپنے اُٹھائے نہ گئے
کعبے کی طرف مزاج لائے نہ گئے
طورِ مسجد کو برہمن کیا جانے
یاں مدّتِ عمر میں ہم آئے نہ گئے

چپکا چپکا پھرا نہ کر تو غم سے
کیا حرف و سخن عیب ہے کچھ محرم سے
آخر کو رُکے رہتے جنوں ہوتا ہے
اے میرؔ کوئی بات کیا کر ہم سے

اب وقتِ عزیز کو تو یوں کھوؤ گے
پر سوچ کے غفلت کے تئیں روؤ گے
کیا خوابِ گراں پہ میلِ روز و شب ہے
جاگو ٹک میرؔ پھر بہت سوؤ گے

ہر لحظہ رُلاتا ہے کُڑھاتا ہے مجھے
ہر آن ستاتا ہے کھپاتا ہے مجھے
کل میں جو کہا رنج ہے میرے حال
بولا ترا آزار خوش آتا ہے مجھے

اے میرؔ کہاں دل کو لگایا تو نے
شکل اپنی بگاڑ کر کُڑھایا تو نے
جی میں نہ ترے حال نہ مُنھ پر کچھ رنگ
اپنا یہ حال کیا بنایا تو نے

دل جن کے بجا ہیں اُن کو آتی ہے خواب
آرام خوش آتا ہے سُہاتی ہے خواب
میں غم زدہ کیا اپنے دنوں کو رو دُوں
میری تو جہاں شب ہوئی، جاتی ہے خواب

شب ابر کہ پیش رَو ہو دریا جس کا
آیا، دل داغ کر گیا جس تس کا
اُس سے ناگاہ ایک بجلی چمکی
کیا جانیے اُس نے گھر جلایا کس کا

جاں سے ہے بدن لطیف، رُو ہے نازک
پاکیزہ ہے تیری طبع، خُو ہے نازک
بلبل نے سمجھ کے کیا تجھے نسبت دی
گُل سے تو ہزار پردہ تُو ہے نازک

ہم عجز سے کہتے ہیں نہ تو رُو یا کر
ہمنفس کمیل کے ٹک چین سے بھی سُویا کر
پایا نہیں جانے کا وہ دُرِّ نایاب
کڑھ کڑھ کے عبث جان کو مت کھویا کر

پوچھو نہ کچھ اس بے سروپا کی خواہش
رکھتی نہیں حد اہلِ وفا کی خواہش

جانتے ہیں چلے جی ہی بتوں کی خاطر
معلوم نہیں کیا ہے خدا کی خواہش

آب حیواں نہیں گوارا ہم کو
کس گھاٹ محبت نے اتارا ہم کو
دریا دریا تھا شوقِ بوسہ لیکن
جاں بخش لبِ یاس نے مارا ہم کو

ہر چند کہ طاعت میں ہو لب پہ تو بیر
پر بات مری سن کہ نہیں بے تاثیر
تسبیح بکف پھرنے سے کیا کام چلے
منکے کی طرح دل نہ پھرے جب تک میر

کیا میر تجھے جان ہوئی تھی بھاری
جو اس بتِ سنگدل سے کی تھی یاری
بیمار بھلا کیا کوئی ہووے اس کا
پرہیز کرے جس سے خدائی ساری

راضی ٹک آپ کو رضا پر رکھیے

مایل دل کو تنک قضا پر رکھیے
بندوں سے تو کچھ کام نہ نکلا اے میرؔ
سب کچھ موقوف اب خدا پر رکھیے

دل خوں ہے جگر داغ ہے رخسار ہے زرد
حسرت سے گلے لگنے کی، چھاتی میں ہے درد
تنہائی و بے کسی و صحرا گردی
آنکھوں میں تمام آب، منھ پر سب گرد

دل خون ہوا ضبط ہی کرتے کرتے
ہم ہو ہی چکے دکھوں کے بھرتے بھرتے
اے مایۂ زندگی، ستم ہے یہ اگر
بھر آنکھ تجھے دیکھیں نہ مرتے مرتے

مستی نہ کر اے میرؔ اگر ہے ادراک
دامانِ بلند ابر نمط رکھ تو پاک
ہے عاریتی جامۂ ہستی تیرا

ہشیار کہ اس پہ نہ پڑے گردِ خاک

ملیے اُس شخص سے جو آدم ہووے
ناز اُس کو کمال پر بہت کم ہووے
ہو گرمِ سخن تو گرد آوے اک خلق
خاموش رہے تو ایک عالم ہووے

ہر صبح غموں میں شام کی ہے ہم نے
خونابہ کشی مدام کی ہے ہم نے
یہ مہلتِ کم کہ جس کو کہتے ہیں عمر
مر مر کے غرض تمام کی ہے ہم نے

ہیں گو کہ سبھی تمھاری پیاری باتیں
پر جی سے نہ جائیں گی تمھاری باتیں
آنکھیں ہیں ادھر روئے سخن اور طرف
یاروں کی نظر میں ہیں یہ ساری باتیں

اتنے بھی نہ ہم خراب ہوتے رہتے
کاہے کو غم و الم سے روتے رہتے
سب خواب سے چونکنے کے ہیں وبال
بہتر تھا یہی کہ وہ ہیں سوتے رہتے

ہم میر بُرے اتنے ہیں وہ اتنا خوب
متروکِ جہاں ہم ہیں وہ سب کا محبوب
ہم ممکن اُسے وجوب کا رُتبہ ہے
ہے کچھ بھی باہم مناسبت کا اسلوب

گو رُوکشِ ہفتاد و دو ملت ہم ہیں
مرأتِ بدن نمائے وحدت ہم ہیں
بے اپنے نمود اُس کی اتنی معلوم
معنی محبوب ہے، تو صورت ہم ہیں

محشر میں اگر یہ آتشیں دم ہوگا
ہنگامہ سب اک لپیٹ میں برہم ہوگا

تکلیف بہشت کا شش مجھکو نہ کریں
ورنہ وہ باغ بھی جہنم ہوگا

ہر صبح مرے سر پہ قیامت گزری
ہر شام نئی ایک مصیبت گزری
پامالی کدورت ہی رہا یاں دن رات
یوں خاک میں ملتے مجھکو مدّت گزری

اب صوم و صلوٰۃ سے بھی جی ہے بیزار
اوراد و وظائف سے کیا استغفار
عقدے نہ کھلے دل کے بسانِ تسبیح
اسمائے الٰہی بھی پڑھے سو سو بار

ہر روز نیا ایک تماشا دیکھا
ہر کوچے میں سو جوانِ رعنا دیکھا
دلّی تھی طلسمات کہ ہر جاگہ میر
ان آنکھوں سے ہم نے آہ کیا کیا دیکھا

آئی نہ کبھو رسمِ تلطف تم کو
کرتے نہ سنا ہم پہ تاسف تم کو
مرتے ہیں ہم اور منہ چھپاتے ہو تم
ہم سے اب تک بھی ہے تکلف تم کو

ہجراں میں کہا سب نے کنارا آخر
اسباب گیا جینے کا سارا آخر
نے تاب رہی نہ صبر و یارا آخر
آخر کو ہوا کام ہمارا آخر

حاصل نہیں دنیا سے بجز دل ریشی
رکھتی نہیں اعتبار یاری خویشی
توفیق رفیق ہو تو سب کر کے ترک
ہے جی میں کہ یک چند کریں درویشی

اوقات جوانی کے گئے عشرت میں
ایام لڑکپن کے کٹے غفلت میں

پیری میں جز افسوس کیا کیا جائے
یکبارہ کمی ہی آ گئی طاقت میں

تا چند تلطف تیر حیا سے ہو گا
شائستۂ صد ستم وفا سے ہو گا
کر ترک ملاقاتِ بُتاں کعبے چل
ان سے ہو گا سو اب خدا سے ہو گا

وہ عہد گیا کہ جور اُس کے سہیئے
وہ بات نہیں رہی کہ چُپکے رہیئے
جب جی ہی چلا گیا تو صرفہ کیا ہے
بے صرفہ جو کچھ، مُنھ میں آئے، کہیئے

حُسنِ ظاہر بھی ہے ہمارے دلخواہ
مجھ صورت بھی ہوں، ہیں معنی آگاہ
باغِ عالم کو چشمِ کم سے مت دیکھ
کیا کیا ہیں رنگ یاں بھی اللہ اللہ

جس وقت شروع یہ حکایت ہوگی
رنجیدگی یک دگر نہایت ہوگی
احوال وفا کا اپنا ہرگز مجھ سے
مت پوچھ کہ کہنے میں شکایت ہوگی

مسجد میں تو شیخ کو خروشاں دیکھا
میخانے میں شورِ بادہ نوشاں دیکھا
اک گوشۂ عافیت جہاں میں ہم نے
دیکھا تو محلۂ خموشاں دیکھا

کیا کریے بیاں محبت اپنی پیارے
دن عمر کے تیرے غم میں گزرے سارے
رنج و ضعف و بلا اذیت محنت
پہنچا ہی نہیں تو ان دکھوں کے مارے

یاروں کو کدورتیں ہیں اب تو ہم سے
جس روز کہ ہم جائیں گے اس عالم سے

اُس روز کھُلے گی صاف سب پر یہ بات
اس بزم کی رونق تھی ہمارے دم سے

رُباعی مستزاد

دِلّی میں بہت سخت کی اب کی گزران ۔ دل کو کر سنگ
غیرت نہ رہی عاقبتِ کار نہ شان ۔ کھینچا یہ ننگ
یاروں میں نہ تھا کوئی مروّت جو کرے ۔ اُجڑے تھے گھر
تا حدِ نظر صاف پڑے تھے میدان ۔ عرصہ تھا تنگ